
بند کواڑ
نریندر لوتھر

بند کواڑ

نریندر لوتھر

ناشر

مکتبہ تحریک ۹/۱ انصاری مارکیٹ، دریا گنج، دہلی ۶

باردوم: ۱۹۶۷ء

Checked

قیمت:

دو روپیہ

پیش لفظ:

نریندر لوتھر

مقدمہ:

عصمت چغتائی

رائیں:

علی جواد زیدی

نثار احمد فاروقی

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی ۶)

فہرست

پیش لفظ

یہ میری پہلی کتاب ہے اور میرا عقیدہ ہے کہ پہلی کتاب کا دیباچہ بالکل نہیں ہونا چاہیے خصوصاً جبکہ وہ کہانیوں کی کتاب ہو۔ مصنف کیا لکھتا ہے، کیوں لکھتا ہے، کیسے لکھتا ہے؟ یہ سب کچھ تو دوسرے لوگوں سے نقادوں کو کہنا چاہیے۔ مصنف کا کام تو صرف لکھنا ہے۔ تخلیق کی کاٹ چھانٹ اور تجہیز و تکفین تو دوسروں کا کام ہے۔ ہاں چار پانچ کتابیں لکھ چکنے کے بعد اگر مصنف چاہے تو وہ ایک بڑا ضخیم سا ہی دیباچہ اپنے آرٹ کے بارے میں لکھ سکتا ہے جس میں وہ تمام نقادوں کو بھی آڑے ہاتھوں لے سکتا ہے۔

اس کتاب میں دس مضامین اور پانچ کہانیاں ہیں۔ ویسے آپ چاہیں تو سبھی کو کہانیاں سمجھ سکتے ہیں۔ دس مضامین "ہلکے پھلکے" ہیں جنھیں طنز و مزاح کی صنف جسے ادب کی صنفِ نازک کہا جا سکتا ہے، میں شامل کیا جا سکتا ہے۔ پانچ کہانیاں المیہ ہیں۔ ترتیب یہ ہے کہ ایک کہانی کے بعد دو مضامین رکھے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا توازن قائم رہ سکے۔ مجھے یہ مشورہ بھی دیا گیا تھا کہ کہانیوں اور مضامین کو علیحدہ

علیحدہ چھپواؤں لیکن میں نے دونوں صنفوں کو ملانا ہی مناسب سمجھا یہی قدرت کا بھی اصول ہے۔ اس کے بغیر آپ اور میں یہاں کیسے ہوتے!

اب رہی شکریے کی بات۔ سب سے پہلے میں حیدرآباد اور یہاں کے ادبی ماحول کا ممنون ہوں۔ اردو مجلس، ہندی پرچار سبھا اور دوسرے ادب نواز دستوں کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میرا شوق فائلوں کے پلندے میں دب کر مرنے سے بچ گیا۔ پھر میں عصمت چغتائی کا شکر گزار ہوں کہ جنھوں نے اپنے طویل دیوانی مقدمے کے درمیان ایک مختصر اور خوب صورت ادبی مقدمے کے لیے وقت نکالا۔

علی جواد زیدی اور فاروقی صاحب نے اپنی قیمتی رائے سے کتاب کو نواز کر بہت ہی عنایت فرمائی ہے۔ گوپال متل کا یہ کتاب چھاپنا بطور ایک پبلشر کے اندھیرے میں چھلانگ لگانے کے مماثل ہے۔ میں نے سن رکھا تھا کہ وہ دلیر آدمی ہیں۔ لیکن جس انداز سے انھوں نے اس کتاب کو شائع کرنا منظور کیا، اس سے اُن کی دلیری کی داد دینا پڑتی ہے میں دعا کرتا ہوں کہ اس کتاب کے کئی ایڈیشن نکلیں تاکہ انھیں مالی طور پر کوئی نقصان نہ ہو۔

میں آل انڈیا ریڈیو اور مختلف رسائل کے مدیروں — بطورِ خاص "سریتا" آج کل، نیا دور، سیاست، شاعر، دورِ حیات، "کلپنا" کا شکریہ ادا کئے بغیر نہیں رہ سکتا جنھوں نے پہلے کہانیوں اور مضامین کو شائع کیا اور پھر کتابی صورت میں چھاپنے کی اجازت دی۔ تقریباً سب طنزیہ اور مزاحیہ مضامین بطورِ خاص آل انڈیا ریڈیو کی فرمائش پر لکھے گئے تھے اور بعد میں شائع بھی ہوئے۔

آخر میں اپنی بیگم کا شکریہ۔ آپ دیکھیں گے کہ اُن کی شخصیت کی چھاپ تمام مضامین پر نمایاں ہے۔ ان مضامین کی تخلیق میں جتنا اُن کا حصہ ہے اس لحاظ سے تو وہ بجا طور پر امید رکھ سکتی تھیں کہ یہ کتاب اُن کے نام سے منسوب کی جائے۔ لیکن

انتساب کی امید تو شاید کبھی اور لوگ بھی لگائے بیٹھے تھے۔ والدین کے ہوتے ہوئے (جنہوں نے مجھے سب کچھ دیا ہے) کتاب کا بیوی کے نام منسوب کرنا تو ایک جھگڑا مول لینا ہے۔ اور بیوی کے ہوتے ہوئے والدین کے نام منسوب کرنا ــــ خیر یہ تو ایک نئے مضمون کا موضوع نکل آیا۔ دراصل انتساب کا خیال میں نے اپنے دقتوں کی وجہ سے نہیں چھوڑا ــــ بلکہ میرا انتساب میں سرے سے یقین ہی نہیں۔ مصنف پر اتنے لوگوں اور اداروں وغیرہ کا احسان ہوتا ہے کہ اس کا ذکر کرنا ہی ناممکن ہے۔ لہٰذا ان میں سے کچھ کا شکریہ ادا کرنے پر ہی اکتفا کرنا چاہیے اور وہ میں نے اوپر کر دیا ہے۔ پڑھنے والے بے شک اس بات کو نوٹ کریں گے کہ یہ سب شکریے تہہ دل سے ہیں!

اب جبکہ آپ مندرجہ بالا سطور پڑھ چکے ہیں تو میں آپ کو یہ پیش لفظ لکھنے کی اصل وجہ بتانے کی جسارت کر سکتا ہوں۔ دراصل بات یہ تھی کہ پورے مواد کی کتابت ہونے کے بعد دو صفحے کی جگہ خالی رہ گئی تھی اور کاتب کو اس جگہ کو پُر کرنے کے لیے کچھ نہ کچھ چاہیے تھا۔ ہائے رے انسان تیری مجبوریاں۔ پیش لفظ میں اعتقاد نہ ہوتے ہوئے بھی اسے لکھنا ہی پڑا!!!

نریندر لوتھر

حیدرآباد

۳۰ جولائی ۱۹۶۴ء

مقدمہ

مقدمہ، پیش لفظ وغیرہ وغیرہ سے میری جان نکلتی ہے۔ میں کبھی کتاب کا پیش لفظ شروع میں نہیں پڑھتی۔ بعد میں اگر بہت خوب صورت ابتدا ہو تو پڑھ ڈالتی ہوں۔ ویسے مجھے لفظ مقدمے کے ساتھ ہی وہ کڑوے کسیلے مقدمات یاد آجاتے ہیں جو جان کا جنجال بن چکے ہیں۔ اور ذہن میں خواہ مخواہ بیڑیاں ہتھکڑیاں بجنے لگتی ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی صاحب ان سطور کو پڑھنے کی تکلیف گوارا کرنے کا فیصلہ کر چکے ہوں تو ان سے درخواست ہے کہ للّٰہ ان چند الفاظ کو مقدمہ نہ سمجھیں۔ بس اگر سمجھنے کی اہم ضرورت محسوس ہو تو ایک عام پڑھنے والے کی رائے سمجھیں اور اگر جی نہ چاہے تو قطعی میرے ہم خیال ہونے کی کوشش نہ کریں۔

میں تنقید نگار نہیں اور پڑھتے وقت سوائے پیشِ نظر تحریر کے اور کوئی مقصد دل میں نہیں ہوتا۔ لطف اندوز ہونے کے لیے پڑھتی ہوں۔ چیز پسند آجائے اپنی محنت وصول ہو گئی۔ جی ہاں پڑھنے والے کو بھی محنت دینا پڑتی ہے اور اگر معاوضے میں کوفت ہو تو یہ بڑی زیادتی ہے۔

نرینہ لودھی کی میں نے سات آٹھ کہانیاں ایک نشست میں پڑھ ڈالیں۔ جی نہیں قطعی کوفت نہیں ہوئی۔ ہلکا پھلکا پن اور دھیما دھیما پُرسکون درد محسوس ہوا۔ بہت زور سے نہیں۔ یونہی لطیف سی ذہن میں مسکراہٹ سی رینگ گئی۔ اسے مزاح لکھوں تو لفظ بہت بوجھل ہے۔ بس ایک بڑی خاموش اور نامعلوم قسم کی فرحت کا احساس ہوتا ہے۔ صاف ستھرا

شبنم میں ڈوبا ہوا کچھ گلابی جاڑوں جیسی کیفیت۔

مگر جس چیز نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ چھوٹے چھوٹے نیچے تلے جملے، زبان نہ ہندی نہ اُردو۔ بڑی عام فہم بھولی بھالی۔ کوری مٹی جیسی سوندھی سوندھی مٹھاس۔ نریندر لوتھر نے یہ زبان نہ جانے کہاں سے اٹھائی ہے۔ مگر ہے بڑی جانی پہچانی، کتابی زبان سے ہٹ کر کچھ گھریلو سی زبان جس میں ایک بھی بوجھل لفظ نہیں۔

نریندر لوتھر کے یہاں خیالات کی بھرمار ہے۔ مگر وہ عام ڈگر سے سوچنے کی کوشش کرتے ہیں ہلکے پھلکے مزاح کے ساتھ ایسے ہی اچھوتے انداز میں المیہ بھی لکھ ڈالتے ہیں۔ "دلِ لخت لخت" کی ٹریجڈی عام روش سے ہٹ کر ہے نہ یہاں سماج کا ظلم ہے نہ والدین کی زبردستی۔ گوتم اپنی مرضی اور اپنی خوشی سے اندرا سے عشق کرتا ہے۔ مگر رتنا سے مل کر اُسے معلوم ہوتا ہے وہ محبت جو اُسے اندرا سے ہے۔ رتنا کے عشق کے آگے کچھ بھی نہیں۔ مگر یہاں خود اس کا دل دو حصوں میں بٹ جاتا ہے۔ ان دو شخصیتوں میں خوب دھواں دار جنگ ہوتی ہے مگر آخر میں گوتم اندرا سے شادی کر لیتا ہے۔ اندرا معیاری بیوی ثابت ہوتی ہے اس لیے گوتم اسوائے اپنے اور کسی کو سزا نہیں دے پاتا۔ اس کی موت کے کافی عرصے بعد تک اندرا کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اب بھی اس کا ہے مگر ایک دن اس کی جیب سے دو خط ملتے ہیں اور اُسے گوتم اور رتنا کی شدید محبت کا پتہ چلتا ہے۔ اُس دن اُسے یقین ہو جاتا ہے کہ گوتم چلا گیا اور اب لوٹ کر نہ آئے گا۔

اتنی کہانیاں سماج اور دُنیا کے ظلم کی پڑھیں کہ جی اُوب گیا شاید اسی وجہ سے یہ کہانی دل کو لگتی ہے کیونکہ یہ عام زندگی سے زیادہ قریب ہے۔ اکثریت لیلیٰ مجنوں اور شیریں فرہاد نہیں ہوتی۔ مگر ٹریجڈی نئی صورتیں لے کر بھی تو زندگی کو تلخ کر سکتی ہے۔

اس کہانی میں جو چند جملے مصنف نے رتنا کے متعلق لکھے ہیں انھیں پڑھ کر حیرت ہوئی:

"عمر تو اس کی ہوگی یہی کوئی ۱۸۔۲۰ برس کے قریب لیکن

اس کے چہرے سے وہ سنجیدگی اور متانت ٹپکتی تھی جو انسان کو مدتوں

آغوشِ تہذیب میں پلنے پر بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔ رتنا کے وجود
میں ایک عجیب وقار تھا اور اس کے حسن میں انوکھا جلال!"
یعنی حد ہو گئی عموماً عورت کے سینے کا اتار چڑھاؤ، گھنیری زلفیں، مرمریں باہیں اور
پھول سے لب ہی لوگوں کو نظر آتے ہیں۔ کہ عورت کے جسم سے کھیلنا ہی عین مردانیت ہے مگر
نریندر سے کبھی یقین نہیں آتا کہ نریندر کو جسم کے علاوہ کبھی کچھ سوجھتا ہے نریندر کی محبوبہ عورت
ہی نہیں انسان بھی ہے۔ بہت سی چیزیں ہیں جنھیں آپ نہ دیکھ سکتے ہیں نہ چھو سکتے ہیں نہ گواہی
میں پیش کر سکتے ہیں۔ یہی حال نریندر کے افسانوں میں چھپی ہوئی دھیمی دھیمی لطافت کا ہے جسے
آپ صرف محسوس کر سکتے ہیں چیر پھاڑ کر کے محسوس کرا نہیں سکتے۔ نہ دلیلوں سے کسی کو قائل کر سکتے
ہیں۔ بس یہ تو کچھ ایسی سے نجی سی چیز ہے۔ جسے چپکے سے سمیٹا اور لطف اندوز ہو لیے۔
اگر میں الگ الگ ہر کہانی کی نزاکتیں بیان کرنے پر اتر آؤں تو ظاہر ہے مزہ کرکرا ہو جائے گا
مگر میں آپ کو رائے دوں گی ذرا "بند کواڑ" "ہم گھر ساجن آئے" "بیت کئے دکھ ہوئے" "چکھیے۔ اور
مصنف کی "پوشیدہ کاری" کی باریکیاں ملاحظہ فرمائیے۔ ہے نا کچھ نئی سی بات کا احساس؟
لیکن یہ تو میری اپنی رائے ہے۔ آپ کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ آپ "دلِ لخت لخت
با" "میں ہوں" سے زیادہ متاثر ہوں۔

عصمت چغتائی

دلِ لخت لخت

اور آخر گوتم شادی کرنے پر رضامند ہو ہی گیا۔ ویسے تو بظاہر شادی سے گریز کی کوئی وجہ نہیں جان پڑتی تھی۔ اندرا وہی لڑکی تھی جس سے اس نے خود محبت کی تھی اور جس کے ساتھ شادی کے فیصلے کو اس نے قطعی قرار دیا تھا۔ پہلے تو جیسا کہ ہوتا ہے چوری چھپے وہ اس سے ملا کرتا تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ اسے اپنے والدین کو سب کچھ بتانا پڑا۔ گوتم نے سن رکھا تھا کہ والدین ہمیشہ محبت کے راستے میں روڑے اٹکاتے ہیں اور ہر نوجوان عاشق کی زندگی میں اس کی محبوبہ کے روپ میں محبت اور والدین کے روپ میں فرض کی آپس میں ٹھن جاتی ہے۔ لیکن اس کی حیرانی کی حد نہ رہی جب اس کے والدین نے فوراً اس تجویز کو مان لیا۔ اور گوتم کی مرضی کے مطابق شادی کرنے کو تیار ہو گئے۔ اپنی تجویز کی فوری قبولیت پر ایک بار تو اسے افسوس بھی ہوا۔ اس نے کیا کیا اسکیمیں بنائی تھیں کہ ماں باپ کے انکار کر دینے پر وہ کیا کرے گا۔ ہری چاچا سے ان پر دباؤ ڈلوائے گا۔ کھانا پینا چھوڑ کر عاشقانہ

وضع اختیار کرے گا۔ خودکشی کی دھمکی دے گا۔ دونوں طرف سے سمجھوتے کی کوششیں ہوں گی وہ ماں باپ کی مرضی کے خلاف سیول میرج کرے گا۔ غرضکہ اس نے کیا کیا سوچا تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس کے والدین نے دانشمند اور آزمودہ کار جرنیلوں کی طرح پیش بینی کر کے اس کی تمام چالوں کو ناکام کر دیا ہو۔ یہ کیسے والدین ہیں گوتم نے سوچا جو مخالفت ہی نہیں کرتے! محبت کا آدھا مزا تو ان تضادموں میں ہے جن کو وہ خود جنم دیتی ہے۔ اس محبت کا کیا مزا جس میں ٹکراؤ نہ ہو کشمکش نہ ہو۔ جدوجہد نہ ہو۔ اونہہ، اس کا عشق بھی بالکل پھیکا نکلا۔ اس نے کیا کیا دعوے کئے تھے۔ اندرا کے لیے وہ ہر قربانی کرنے کو تیار تھا لیکن یہ کیا! اس کے والدین نے اس سے قربانی کا موقع ہی چھین لیا تھا۔ والدین نے اس کی محبت کی مخالفت نہ کر کے اس کے عشق سے عظمت کا جز ہی خارج کر دیا تھا۔ کیا انوکھاپن رہ گیا تھا اب اس کے عشق میں؟ اس کی شادی بھی اب ان روایتی ٹھنڈی شادیوں میں سے ایک ہو گئی تھی جن کی تصویروں سے ہفتہ وار اخبارات بھرے پڑے ہوتے ہیں۔ اس وقت جب کہ اس کی اتنی اہم مانگ پوری ہو رہی تھی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ کہیں نہ کہیں کسی نے دھوکہ کیا ہے؟

لیکن شادی سے گریز کی وجہ صرف اس کے عشق کا پھیکاپن ہی تو نہیں تھا کچھ اور بھی تو تھا۔ دو سال ہو گئے تھے اس کی مانگ کو پوری ہوئے۔ لیکن یکایک اس نے شادی کی بات سے کترانا کیوں شروع کر دیا تھا! پہلے تو نوکری کا سوال تھا وہ بھی اب پورا ہو چکا تھا ایک انگریزی کمپنی میں اسے اچھی نوکری مل گئی تھی اور اچھا بنگلہ اور نوکر چاکر موٹر وغیرہ سب کچھ تھے۔ ان حالات میں اس کا شادی سے کترانا سب کو عجیب معلوم ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر اس مسئلہ کو یہ کہہ کر ٹال دیتا تھا کہ میں ابھی شادی کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کے قابل نہیں ہوں۔ لیکن جب وہ دیانت داری سے اپنے دل کو ٹٹولتا تو وہ خود اپنے سے یہ چھپا نہ سکتا کہ وہ اندرا

سے دور جا چکا تھا اور آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر رتنا کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔ رتنا سے اس کی ملاقات ایک بڑی پارٹی میں ہوئی تھی لیکن جس قسم کی لڑکیوں کو سیاسی میں پارٹی گرلز کے نام سے منسوب کیا جاتا ہے۔ رتنا ان سب سے جداگانہ تھی۔ تعارف کرائے جانے کے بعد دونوں نے ایک دوسرے سے ایک دو رسمی باتیں کیں اور اتنے ہی سے گوتم جان گیا کہ رتنا لاکھوں میں اپنی قسم کی ایک ہی لڑکی تھی۔ جب گوتم پارٹی سے واپس آیا تو ایک ٹھوس قسم کی خوشی اس کے دل میں کروٹیں لے رہی تھی۔ جب وہ اپنے کمرے میں پہنچا تو ایک مسکراہٹ اس کے لبوں پر ناچ رہی تھی۔ کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلنے کے لیے مڑا تو قد آدم آئینے پر اس کی نظریں جا پڑیں اور وہ ٹھٹک کر وہیں رہ گیا۔ آئینے میں دیکھا تو اپنے عکس کی بجائے وہاں رتنا کھڑی تھی ——— وہ خوب صورت تھی، بہت خوب صورت لیکن اس میں جنسی کشش کے بجائے ایک قسم کی روحانی کشش تھی۔ اس کی آنکھیں اس جھیل کے پانی کی طرح شفاف تھیں جس میں پہاڑ کا عکس ٹھہر کر اس کے اجلے پن کو اور بھی نمایاں کر دیتا ہے۔ اس نے سفید ساڑی پہن رکھی تھی جو اس کے وجود کے غیر مرئی پن میں اضافہ کر رہی تھی۔ گوتم نے دیویوں کے بارے میں سن رکھا تھا۔ آج اس نے اپنی آنکھوں سے ایسی دیوی کو دیکھ لیا تھا جس کی عبادت کرنے کے لیے ایک عمر تو کیا وہ بار بار پیدا ہونے کو تیار تھا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کی منزل آن پہنچی ہو۔ اس کی روح کو جس کی مدتوں سے تلاش تھی۔ وہی اس کے سامنے مسکرا رہی تھی۔ عمر تو اس کی ہوگی یہی کوئی ۱۸۔۲۰ برس کے قریب لیکن اس کے چہرے سے وہ سنجیدگی اور متانت ٹپکتی تھی جو انسان کو مدتوں آغوشِ تہذیب میں پلنے پر بھی مشکل سے حاصل ہوتی ہے۔

رتنا کے وجود میں ایک عجیب وقار تھا اور اس کے حسن میں ایک انوکھا جلال، رتنا کی ایک مسکراہٹ گوتم کی زندگی کا روکھا پن مٹانے کے لیے کافی تھی۔

وہ پھر ملے اور پھر ملے اور پھر ان کا ملنا عام ہوگیا۔ وہ پارٹیوں میں ملتے ایک دوسرے کے گھر پر ملتے اور کبھی کبھار اکیلے بھی۔ ہر ملاقات ان کو ایک دوسرے کے پاس لاتی رہی۔ حتیٰ کہ ان کی قربت کی آنچ ایک دوسرے کی شرط حیات بن گئی۔ گوتم کو رتنا کے ساتھ بے پناہ محبت و عقیدت تھی اور جب اسے یقین ہوگیا کہ رتنا کے جذبات بھی اس کے لیے اتنے شدید ہیں تو جیسے اچانک گوتم نے اپنے آپ کو یاد دلایا کہ کبھی اس نے اندرا سے بھی محبت کی تھی۔ اور اس کے ساتھ شادی کا وعدہ بھی کیا تھا۔ جذبات چاہے کچھ بھی ہوں گوتم بے حد سمجھدار، سنجیدہ، وفاشعار اور صاف گو واقع ہوا تھا۔ ایک دن اس نے رتنا کو بتا دیا کہ شاید انھیں اس سے آگے نہ بڑھنا چاہیے کیونکہ اس نے اندرا سے پیار کیا تھا اور شادی کے لیے اندرا اس کا انتظار بھی کر رہی ہے۔

رتنا بھی عجیب لڑکی تھی۔ اس بات کو سن کر وہ جل نہیں اٹھی، روئی نہیں، ہنس پڑی اور بڑے ضبط سے بولی۔

"بڑی اچھی بات ہے کبھی اپنے پیار کی کہانی تو سنائی نہیں!"

گوتم نے دیانت داری سے ساری کہانی سنا ڈالی۔ رتنا بڑے غور اور صبر سے سب کچھ سنتی رہی۔ پھر مسکراتی ہوئی آہ بھر کر بولی۔

"واہ صاحب اتنی بھی جلدی کیا پڑی تھی آپ کو کچھ تو انتظار کر لیا ہوتا!"

اور پھر ایک دم اپنے آپ کو سنبھال کر بولی جیسے اپنی لغزش کو چھپانا چاہتی ہو۔

"میں مانتی ہوں آپ پر اندرا بہن کا حق ہے۔ اس کا حق نہیں چھینوں گی۔"

"بہن!" گوتم گھبرا اٹھا۔ کس نا اسے رتنا اندرا کو موسوم کر رہی تھی۔ ایسی حالت

میں کوئی اور عورت کسی رقیب کے نام کو بالکل برداشت نہ کرسکتی لیکن کس احترام اور پیار سے رتنا، اندرا کا ذکر کر رہی تھی۔ ایسی ہی باتیں تھیں جو گوتم کو رتنا کا اور بھی گرویدہ بنا دیتی تھیں۔

ایک دو بار گوتم نے کہنا چاہا ــــــ "ہمیں ایک دوسرے سے ملنا نہیں چاہیے ورنہ ...."

رتنا اس کی بات کاٹتی ہوئی کہتی "یہ تم کیا کہتے ہو؟ میں تم سے کچھ نہیں مانگتی مجھے صرف اپنے آپ سے پیار کرنے دو۔"

اور گوتم کا ابھرتا ہوا عزم بے سہارا ہوکر پھر لوٹ جاتا۔ اب اندرا ان کی ملاقاتوں کی گفتگو کا ایک لازمی موضوع بن گئی تھی۔ ان کی قربت کے بہت قیمتی لمحوں میں رتنا مسکرا کر اچانک پوچھ بیٹھتی "اندرا بہن کیسی ہیں؟ کبھی ان کی کوئی بات سنایا کرو۔" یہ بات گوتم کو بہت اداس کر دیتی اسے ایک دم رتنا پر غصّہ بھی آتا۔ پیار کے سہانے لمحوں میں اس کی یہ بات کتنا بے سرا پن پیدا کر دیتی ہے لیکن پھر فوراً ہی اسے کچھ اپنے جرم اور ندامت کا احساس ہوتا وہ ایسا محسوس کرتا گویا رتنا نے اس کے جرم، اس کے پاپ پر انگلی رکھ دی ہو۔ اگر گوتم کے دل کے اندر اندرا ایک بار داخل ہو چکی تھی تو پھر کیوں گوتم نے رتنا کے دل کے کواڑ پہ دستک دی؟

وہ اپنے آپ کو کوستا اور پھر کوستا اندرا کو۔ ماضی کے ہولناک سائے کیوں اس کے حال اور مستقبل کو تاریک کئے جاتے ہیں؟

اور گوتم کو اداس دیکھ کر رتنا بڑے شوخ انداز میں اسے گویا چھیڑنے کے لیے کہتی (حالانکہ عام طور پر چھیڑنا اس کی خصلت میں نہ تھا)

"کیوں اندرا بہن کی یاد آگئی ہے" اور پھر گویا ترس کھا کر گوتم کو دلاسا دیتے

ہوئے کہتی ۔۔۔

"کوئی بات نہیں۔ انھیں بھی یہیں بلالیں گے۔" اور گوتم رو ہانسا ہو کر رتنا کی گود میں سر ڈال دیتا۔ دونوں جانتے تھے کہ اُن کے درمیان ایک ناقابلِ عبور خلیج حائل ہے جس کی وسعتیں گوتم اور رتنا دونوں کی اخلاقی قدروں کی وجہ سے اور بھی بڑھ گئی تھیں۔ گوتم خود رتنا پر دل وجان سے مرتا تھا۔ اس کی عبادت کرتا تھا۔ اسے پاکر وہ کیا کچھ نہ پالیتا۔ اس کی زندگی سہل ہو جاتی۔ لیکن.......

لیکن گوتم خود اپنے خلاف تھا۔ اس کا رویہ اپنے ساتھ بھی نہایت منصفانہ اور غیر جانب دارانہ قسم کا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ جذبات چاہے کچھ بھی ہوں، انصاف کی بنا پر اندرا کو اس پر قطعی حق حاصل تھا۔ اس کی دلیل یہ تھی کہ اندرا اس کی زندگی میں پہلے داخل ہوئی تھی اس لیے وہی اس کے دل کی مالک ہو سکتی تھی۔ جیسے راشن کی دوکان پر جو "کیو" میں پہلے آکھڑا ہوا اسی کا شکر پہلے لینے کا حق ہو جاتا ہے گویا گوتم کو پیار بھی آٹے اور چینی کی طرح "کیو" کے مروجہ ضابطے سے ہی مل سکتا تھا۔ وہ یہ بات جانتے ہوئے بھی نظرانداز کرنا چاہتا تھا کہ ضابطہ، نظام اور ترتیب کا پیار سے کوئی علاقہ نہیں محبوب تو سارے کیو، سارے قوانین اور ضابطے توڑ کر اپنے محبوب تک پہنچ جاتا ہے۔ یا پھر چپکے سے چور دروازے سے داخل ہو جاتا ہے۔ کوئی قانون، ضابطہ اور حکم اسے قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ گھنٹوں اس کی خود اپنے آپ کے ساتھ بحث ہوتی اور اس کے اندر کے دو گوتم اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے۔

"اندرا کو بھول جاؤ۔ رتنا تمہارا ازل سے انتظار کر رہی ہے۔ رتنا تمہارے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔" "یہ بے وفائی ہے۔ اندرا کا حق تم پر افضل ہے۔ اندرا نے پہلے تمہیں ڈھونڈا ہے۔"

"ڈھونڈنے کی بات چھوڑو۔ تم شادی کرنا چاہتے ہو۔ شادی اسکا کیسا تھ

ہو سکتی ہے۔ جو تمہارے دل و دماغ میں بسا ہے۔ شادی تمہاری خوشی کی بات ہے۔"

"تم کسی کی آرزوؤں کا خون کر کے اپنی خوشیوں کا محل کیسے کھڑا کر سکتے ہو؟"

"یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے۔ عمر بھر کی خوشی چاہتے ہو یا عمر بھر کی نیند؟ رتنا کو چھوڑ کر تم کہیں اور تسکین نہیں پاؤ گے۔"

"یہ صرف تمہاری زندگی کا ہی سوال نہیں کسی اور کی بھی زندگی کا سوال ہے۔ حق و باطل کا سوال انصاف اور ظلم کا سوال۔"

"اپنے دل کا خون نہ کرو۔ اپنے پاؤں پر کلہاڑی مت مارو۔ محبت کی آواز سنو۔"

"فرض کی پکار کو مت ٹھکراؤ۔"

فرض اور محبت، محبت اور فرض اور پھر دونوں گوتموں میں تُو تُو میں میں شروع ہو جاتی، ہاتھا پائی ہو جاتی اور دونوں گتھم گتھا ہو جاتے۔ کھلم کھلا لڑائی شروع ہو جاتی۔

اور پھر گوتم کے دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی، وہ کراہ اٹھتا وہ دونوں گوتموں کو ڈانٹ ڈپٹ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ جانے کو کہتا۔

لیکن یہ تو روز کا معمول ہو گیا تھا۔ جب بھی وہ اسے اکیلا پاتے دونوں گوتم آہستہ آہستہ سے اٹھتے۔ اور پچھلے چند دن اس پر زور آزمائی کرنا شروع کر دیتے جو ہمیشہ اسی دھینگا مشتی اور لڑائی پر ختم ہوتی۔

آخر ایک دن تنگ آکر اس نے رتنا کے حامی گوتم کو خوب ڈانٹا اُسے سخت سُست کہا اور اسے اپنے دل سے نکل جانے کو کہا۔ وہ چپ چاپ منہ لٹکائے آنکھوں میں آنسو چھپائے نکل گیا۔

اس کے جانے سے گوتم کا دل پریشان ہو گیا، اداس ہو گیا اور وہ اپنے

اندرا ایک خلا سا محسوس کرنے لگا۔ لیکن اب وہ پکا فیصلہ کر چکا تھا۔ اگر گوتم جج ہوتا اور خود اس کا بیٹا قتل کے جرم میں اس کے سامنے پیش ہوتا تو وہ بلا جھجک پھانسی کی سزا دے دیتا۔ اپنے ساتھ بھی گوتم نے ایسا ہی کیا۔

اسی شام وہ رتنا کے پاس گیا اور رُندھے ہوئے گلے سے اس نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔ "رتنا! میں اگلے مہینے اندرا سے شادی کر رہا ہوں۔"

رتنا کے چہرے پر وہی مخصوص مسکراہٹ آگئی جو اندرا کے نام پر ہمیشہ آیا کرتی تھی لیکن آج اس مسکراہٹ میں وہ سب حزن و یاس چھپا ہوا تھا وہ بے بسی وہ بے چارگی تھی جو گوتم کے لیے جنم جنم کے ناکام انتظار نے اس کے اندر پیدا کر دی تھی۔ رتنا کی اسی مخصوص مسکراہٹ نے اسے عام عورتوں کے زمرے سے الگ کر رکھا تھا۔ وہ بہت اونچائی پر بیٹھی ہوئی ایک دیوی لگ رہی تھی جسے انسانوں کی دنیا و ی کاروبار سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ اور جو انسانوں کی دعاؤں اور بد دعاؤں کے جواب میں یکساں طور پر ابدی مسکراہٹ ہی سے جواب دیتی ہے اور پھر جیسے رتنا کے صدیوں کے رُکے ہوئے آنسوؤں کو راستہ مل گیا۔ اس کا چہرہ تمتما اٹھا اور وہ بولی ــــ

"بہت خوشی کی بات ہے۔ ہمیں بھی بلائیے گا۔"

اور جس گوتم کو گوتم نے ابھی ابھی اپنے دل سے مار بھگا تھا وہ چلاتا ہوا دوڑتا ہوا اچھلتا ہوا واپس آگیا اور دل کی چوکھٹ پر کھڑا ہو گیا۔

گوتم نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

"رتنا اگر اب بھی تم صرف ایک بار ہاں کہہ دو تو میں اندرا کو چھوڑ کر تمہارا ہو سکتا ہوں۔"

رتنا کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسوؤں نے اپنے راستے بنا لیے تھے۔ وہ ایک

وہ چونکی اور ایسے انداز میں بولی جس میں حیرانی کے ساتھ کسی قدر تضحیک آمیز جذبے کی تلخی بھی شامل تھی۔

"اندرا بہن کا تم پر حق ہے۔ میں کسی کا حق کیسے چھین سکتی ہوں؟ میں اپنے ہاتھوں سے تمہیں اندرا بہن کو سونپوں گی۔"

رتنا کے انداز میں ایسی قطعیت تھی کہ وہ لڑکا جو گوتم کے دل کی چوکھٹ پر کھڑا تھا، پھر دوڑ کر بھاگ گیا۔ دوسرے لڑکے نے قہقہہ لگایا اور گوتم کے دل کے کواڑ بند کر دیئے۔ اب گوتم کے پورے دل پر اس دوسرے لڑکے کا پورا قبضہ تھا۔

شادی کے دن سے دو روز پہلے ایک بار پھر گوتم رتنا سے ملنے آیا۔ یہ دو کنوارے دلوں کی آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد دونوں کی منزلیں الگ الگ اور راستے جدا جدا تھے۔ جیون کے سفر میں ایسے ساتھیوں کا بچھڑ جانا نکاہ ہی تو ہوتا ہے۔ رتنا نے اپنے ہاتھوں سے گوتم کے قدم چھو کر اپنی مانگ بھری اور پھر گوتم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "اندرا بہن کو خوش رکھنا۔"

یہ آخری چوٹ تھی اور گوتم اس کو سہہ نہ سکا۔ وہ چکرایا کبھی کسی نے اپنا خزانہ ایسے بھی لٹایا ہے؟ راجپوت عورتیں بھی تو اسی ضبط اور خوشی کے ساتھ اپنے مردوں کو دشمن کی تلوار کے دھارے پر دھکیلتی تھیں۔ شاید رتنا پچھلے جنموں میں ہمیشہ راجپوتنی ہی پیدا ہوتی آئی تھی۔

گوتم کی شادی میں رتنا نہیں آئی۔ اور صرف یہی بات تھی جس سے گوتم کو اس کے عورت ہونے کا یقین آیا۔ اگر وہ شادی میں شرکت کرتی تو گوتم کو یقین ہو جاتا کہ یا تو رتنا مٹی کا بت ہے یا سرے سے اسے گوتم سے کوئی لگاؤ ہی نہیں تھا۔ خود گوتم کا یہ حال تھا کہ دو سال پہلے جس لڑکی کے ساتھ وہ سولہ میرج کے خواب دیکھا

کرتا تھا آج اسی کے ساتھ منڈپ میں بیٹھے نہ جانے کیوں اس کے دماغ کو ہیبتناک قسم کے خیالات ڈسے جا رہے تھے۔

ہندوستان میں شادی ہو تو بچے تو گویا پیدا ہونے کے لیے تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ بس یہی غنیمت ہے کہ لڑکیاں اپنی دوشیزگی کا لحاظ رکھتے ہوئے بچے جہیز میں نہیں لاتیں ورنہ ادھر شادی اُدھر بچہ۔ ہر ہندوستانی لڑکی کا حق اور فرض ہے کہ اس کی گودی سدا ہری رہے اور وہ اپنے خاوند کو لالوں سے دھڑا دھڑ مالا مال کرتی رہے۔ اندرا بھی اس لحاظ سے خالص ہندوستانی لڑکی تھی اور پھر شاید ہر ہندوستانی ماں کی طرح اس کی ماں نے بھی ڈولی میں چڑھتے ہوئے اس کے کان میں پھونک دیا تھا کہ جب تک بچہ نہیں ہوتا مرد پوری طرح قابو میں نہیں آتا۔ جہاں تک بیوی اور خاوند کے رشتے کا اس بات سے تعلق تھا ظاہر ہے اندرا کوئی کسر نہ چھوڑنے والی تھی مختصر یہ کہ بہت کم عرصے میں اندرا نے اپنے خاوند کو تین بچوں کا باپ بنا دیا۔

بچوں کے علاوہ اندرا گوتم کو وہ سب کچھ دیتی جس کی توقع بہترین بیویوں سے کی جا سکتی ہے۔ وہ کام کرنے والی پیار کرنے والی اور خاوند کی تقریباً عبادت کرنے والی لڑکیوں میں سے تھی۔ وہ ایسی لڑکیوں میں سے تھی جو صرف شادی کے لیے ہی پیدا ہوئی ہیں جن کی انفرادیت شادی کے بعد ہی نکھرتی ہے۔ جن کی شخصیت کا پودا گھر کی چاردیواری میں ہی پنپتا ہے اور بچوں اور خاوند کی گھما گھمی اور اہتمام جس کے لیے امرت سے کم نہیں ہوتا۔ دوسرے لفظوں میں اندرا شادی اور گھربار کے لیے "آئیڈیل" تھی اور ایسی بیوی کسی اجڑے سے دل کو شاداب نہیں کر سکتی تھی ــــ اور خاص طور پر جب کہ اس کا کام صرف ماضی کے ساتھ مکمل الحاق کا ثبوت دینا ہی ہو۔ اندرا نے بڑی خوش اسلوبی سے اپنی بے لوث خدمت اور پیار کے ذریعے گوتم کو ریشم کے دھاگوں سے جکڑ لیا۔ وہ گوتم کی ازدواجی زندگی میں اضافتی روپ

سے آئی تھی۔ گوتم کو اس بات کا پورا اعتراف تھا اور وہ سچے دل سے، پُرخلوص طریقے سے اور رُوحانی وفاداری کے ساتھ اس بات کا کوشاں رہتا کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ اندرا کے پیار کا بدل تو دے سکے لیکن دل آخر دل ہے کوئی میلا کپڑا تو ہے نہیں کہ کبھی اس کھونٹی پر ٹانگا تو کبھی اس پہ۔ اگر جسم کی اپنی کمزوریاں ہیں تو دل اپنی جگہ مجبور ہے جسم وقتی ضرورتوں سے دب کر سمجھوتہ کر سکتا ہے لیکن دل کا تو اپنا شیوہ ہے۔ جسم اور دل کی تو آپس میں کبھی نہیں بنتی۔ اور چونکہ جسم بڑا ہے، تگڑا ہے اس لیے ہمیشہ دل پر غالب آجاتا ہے۔ بے چارہ دل اسی لیے تو ایک کونے میں سہما ہوا پڑا رہتا ہے گوتم کا جسم تو اندرا کا غلام ہو چکا تھا لیکن دل میں کبھی کبھی چنگاری سلگ جاتی۔ جسم تو اندرا کا نام لے کر قسم کھاتا لیکن دل اب بھی کبھی کبھی رتنا کے لیے آہ بھر لیتا۔

شادی کے بعد رتنا سے وہ کبھی ملا نہیں تھا اور نہ ہی اس سے کبھی خط و کتابت ہوئی تھی۔ ہاں اس کا دوست ہرش جب بھی خط لکھتا کچھ نہ کچھ حال رتنا کا بھی لکھ دیتا۔ اسی سے اسے معلوم ہوا تھا کہ رتنا نے ابھی تک شادی نہیں کی اور اپنے گھر میں وہ تقریباً اکیلی ہی رہتی ہے۔ گوتم کی زندگی پرسکون تھی۔ گھر بار، بال بچے، نوکر چاکر اور موٹریں۔ غرضیکہ ہر چیز کی بہتات تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں کبھی کبھی اندرا کے ساتھ لطیف ترین لمحات میں بھی اسے نامعلوم سے مقام پر کسی غیر مرئی بوجھ کے احساس سے گھٹن سی محسوس ہونے لگتی۔ ایسا بوجھ جیسے گوتم کہیں اتارنا بھول گیا ہو، اور جو زہر کی طرح آہستہ آہستہ اس کے جسم میں سرایت کرتا جا رہا ہو۔

گوتم بظاہر ایک مثالی خاوند اور شفیق باپ تھا اور اندرا کو بھی اپنے خاوند پر پورا اعتماد تھا اور اس کی پوری محبت حاصل ہونے پر فخر بھی تھا۔ زندگی کی گاڑی آرام سے چل رہی تھی کہ اچانک ایک ہچکولا لگا۔ ایک دن نئے سال کی شام کو گوتم جب دفتر سے واپس آیا تو اس کے چہرے پر تکان اور افسردگی کے نشان نمایاں

تھے۔ گھر آتے ہی وہ بستر پر پڑ گیا اور ہلکے سے بخار اور سر درد کی شکایت کی۔ اندرا نے سوچا شاید زیادہ کام کی وجہ سے تھک گئے ہوں گے۔ اور اسپرو وغیرہ کھانے سے ٹھیک ہو جائیں گے۔ لیکن رات کو گوتم کو زوروں کا بخار چڑھ آیا اور وہ بے ہوشی کی حالت میں کبھی کبھی بڑبڑاتا بھی رہا۔ دوسری صبح تو بس ڈاکٹروں کا تانتا لگ گیا۔ ڈاکٹروں کی رائے میں زیادہ فکر کی وجہ سے شاید اعصابی حملہ (NERVOWS BREKDOWN) ہو گیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ وہ چند دنوں کے مکمل آرام سے ٹھیک ہو جائے گا۔

شام کو گوتم نے اندرا کو اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے اُس کے بالوں میں ہاتھ سے کنگھی کرتے ہوئے بولا " اندرا! میں تمہارے پیار کے بدلے تمہیں کچھ نہ دے سکا۔" گوتم کے انداز میں ایک کرب انگیز اعتراف تھا۔ اندرا اس اشاریت سے گھبرا گئی اور بولی: " ہائے رام یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نے تو آپ کے چرنوں میں سب کچھ پا یا ہے۔" گوتم نے ایک لمبی سانس لی اور ایسی نظروں سے اندرا کی طرف دیکھا جن میں ازلی اُداسی کے سوائے کچھ نہ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسے بولنے کے لیے خاص ہمت سے کام لینا پڑ رہا ہے۔ اندرا یہ دیکھ کر کانپ اٹھی اور پھر گوتم نے بلندی سے گرتے ہوئے بچے کی طرح اندرا کو زور سے تھام لیا اور مدھم سی چیخ کے ساتھ بولا:

" میں چلا اندرا مجھے معاف کر دو میں چلا "۔

اور بغیر اندرا کے جواب کا انتظار کئے گوتم چلا گیا۔ اندرا رو نہ سکی چیخ نہ سکی۔ بس پھٹے پھٹے دیدوں سے اُس اندھیرے کو چیر کر دیکھنے کی کوشش کرتی رہی جو اس کے گرد دھوئیں کی طرح بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ اس طرح اچانک اس جوانی میں

ہندوستانی عورت کا وہ دھواں اپنے پورے بوجھ کے ساتھ اندرا پر آن گرا!

اس بات کو چھ مہینے گزر گئے۔ لیکن اندرا ابھی تک یہ ماننے سے برابر انکار کئے جا رہی تھی کہ گوتم مر چکا ہے۔ اسے یقین تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ بار ہا گوتم ایسے ہی دورے پر جایا کرتا تھا اور جاتی بار کہتا "اچھا میں چلا" اس بار بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ شاید کچھ دیر لگ گئی ہو۔ لیکن وہ آئے گا ضرور۔ اس نے گوتم کی کوئی چیز ادھر سے ادھر نہیں کی۔ سہمے ہوئے بچے اگر کسی چیز کو ہاتھ لگانے لگتے تو انھیں ڈانٹتی "مت چھیڑو ان کی چیزیں۔ وہ آئیں گے تو غصہ کریں گے" اور معصوم بچے سوچتے کہ جیتے جی جس باپ نے کبھی غصہ نہ کیا ہو، وہ موت کے بعد غصہ کیوں کرے گا؟ یتیم بچوں کو بھی ماں کی ویرانی اور بے کسی پر ترس آنے لگا تھا۔ جب کھانا میز پر لگایا جاتا تو گوتم کی پلیٹ بھی لگتی اور اندرا گوتم کے انتظار میں نہ جانے کس سوچ میں بیٹھی رہتی۔ پھر جب سب کھا کر اٹھ جاتے تو اندرا بھی بھوک اور غم سے نڈھال ایک دو نوالے منہ میں ڈال کر اٹھ بیٹھتی۔ اس طرح پہاڑ سا دن رات ہو جاتا اور رات کے اندھیرے پھر سحر کے اجالوں میں تحلیل ہو جاتے۔ اگر اندرا کی زندگی ویران اور اس کے دن افسردہ تھے تو کیا ہوا۔ نظام شام و سحر تو ایک افسردہ روح کی خاطر نہیں بدلا جا سکتا! اگر ایک طاق ویران بھی ہو تو بزم چراغاں پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اندرا اپنے غم میں اکیلی تھی اس کی زندگی انتظار کی ایک طویل شام تھی۔

ایک دن موسم بدلنے پر اندرا نے گوتم کے کپڑوں کو دھوپ دینے کے لیے نکالا۔ سب سے پہلے جو سوٹ اٹھایا وہ وہی تھا جو گوتم آخری دن پہنے ہوئے تھا۔ اسے اٹھایا اور جیبیں ٹٹولیں تو اندر کی جیب میں اسے دو خط گوتم کے نام لکھے ہوئے ملے۔ اس نے ایک خط اٹھایا۔ یہ نئے سال سے کچھ دن پہلے کا لکھا ہوا تھا۔ عجیب سا خط تھا۔ لکھا تھا ——

"گوتم۔ آج تک میں نے تمہیں خط نہیں لکھا۔ اور یہ شاید میرا آخری خط ہو۔ تم سے ملنے سے بہت پہلے میں نے اپنی شادی کا ایک سپنا دیکھا تھا اور جب اچانک اس پارٹی میں تم سے ملاقات ہوئی تو میں نے سوچا میرا سپنا پورا ہو گیا اس کے بعد میں نے تمہیں ہمیشہ اور ہر روپ میں چاہا ہے اور کبھی ایک لمحہ بھی مجھے یہ خیال نہ آیا کہ زندگی میں تم مجھ سے کبھی جدا بھی ہو گے۔

لیکن جب تم نے بتایا کہ تم اندرا کی جائیداد جن چکے ہو تو میں نے ایک دم اپنی ہار مان لی۔ میں نے خود تمہیں اندرا کو سونپا ہے کیوں کہ ہم دونوں سمجھتے تھے کہ اندرا کا تم پر حق ہے لیکن میں نہ جانتی تھی کہ میں اتنی بڑی قربانی کے قابل نہ تھی میں تمہارے پیار کی آگ میں سلگ سلگ کر ختم ہو چکی ہوں اور اب تو یہی چاہتی ہوں کہ زندگی کا بوجھ اتار کر پھینک دوں۔ میں نے تمہیں پانے کے لیے بہت تپسیا کی ہے اور میں صدیوں تک تمہارا انتظار کر سکتی ہوں لیکن دیکھنا اگلے جنم میں تم اتنی جلدی نہ کرنا؟ اندرا کو خوش رکھنا اس سے مجھے بہت راحت ہو گی۔

رتنا"

اندرا بوکھلا گئی۔ جھپٹ کر اس نے دوسرا خط کھولا۔ یہ پہلے خط کے دو دن بعد کا لکھا ہوا تھا۔ یہ ہریش کا خط تھا۔ ہریش کے ہاتھ کا خط وہ پہچانتی تھی۔ خط میں لکھا تھا ——

"رتنا کو زندگی کے اذیت ناک بخار سے نجات مل

گئی۔ کل رات وہ ایسی سوئی کہ پھر نہ اٹھی۔"

اندرا نے دونوں خطوں کو دوبارہ پڑھا۔ تاریخوں کو پھر سے پڑھا۔ اس کے ہاتھ سے دونوں پرزے گر گئے اور اسے کہیں دور سے گوتم کی آخری التجا سنائی دی "اندرا! میں چلا۔۔۔ مجھے معاف کر دو۔ میں چلا۔"

اندرا نے مڑ کر دیکھا تو گوتم سامنے تھا۔ ایک فریادی کی طرح ملتجی نگاہوں سے اندرا کو دیکھ رہا تھا۔ اندرا گوتم سے چمٹ گئی اور کہا "میں نے تمہیں معاف کیا۔" اور پھر رکے ہوئے سیلاب امڈ آئے اور گوتم کی موت کے بعد آج پہلی بار اندرا بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اب جانتی تھی گوتم اب کبھی نہیں آئے گا۔

ہم نے بچہ بٹھایا

کچھ عجیب اور مزاحیہ سا عنوان ہے۔ دراصل ترجمے میں ہمیشہ یہی بات ہوتی ہے۔ یہ ایک انگریزی ـــــــ بلکہ اگر میں کہہ سکوں تو امریکن زبان کی اصطلاح کا ترجمہ ہے (بے بی سٹنگ)

بے بی سٹنگ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا بس اس کے ترجمے کا یہ نتیجہ نکلا۔ ویسے اس کے لمبے چوڑے ترجمے تو کئی ہو سکتے ہیں لیکن یہاں تو ہمیں اس کے اصل معنی سے غرض ہے۔ اس محاورے کا مطلب تو ظاہر ہے صاف ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ امریکن لوگ ہمارے رسم و رواج اور روایات کے لحاظ سے ہر بات میں الٹے ہیں، اس لیے اس محاورے کا مطلب بھی بالکل الٹا ہی لینا چاہیے۔ دوسرے لفظوں میں عنوان "ہم نے بچہ بٹھایا" کا مطلب بچے نے ہم کو بٹھایا، لینا چاہیے۔ بھلا بچوں کو آج تک کون بٹھا سکا ہے جو ہم یہ کام کر سکتے!

امریکہ اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں میں چونکہ ہر آدمی ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے میں مصروف رہتا ہے اس لیے زندگی کے معمولی روزمرہ اور غیر ضروری کاموں کے لئے ان کے پاس کوئی وقت نہیں رہتا۔ مثلاً بچوں کو پالنا اور ان کی دیکھ بھال کرنا اور ان کے پاس بیٹھنا، مصروف آدمیوں کے لیے بہت مشکل ہوتا ہے اس لیے اس کام کو بھی وہاں ایک الگ پیشہ بنا دیا گیا ہے۔ جوان لوگ بچے پیدا کرتے ہیں اور دوسرے لوگ جو بچے نہ پیدا کرتے ہوں دن میں کچھ وقت کے لیے بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور اس طریقے سے اپنی روزی بھی کما لیتے ہیں۔

ایسے کام کو وہاں بچے بٹھانا کہا جاتا ہے اور ایسے کام کرنے والوں کو بچے بٹھانے والے کہا جاتا ہے۔ نہ جانے یہ نام کیسے رائج ہوگیا۔ لیکن آپ جانتے ہیں امریکن لوگوں نے آخر کچھ سوچ سمجھ کر ہی یہ نام رکھا ہوگا۔

خیر یہ ذکر تو اس بات سے چلا کہ ابھی حال ہی میں مجھے ایسا کام کرنے کا موقع ملا، یا یوں کہئے کہ یہ موقع مجھ پر لاد دیا گیا۔

بیگم کی کئی برس سے شکایت تھی کہ انھوں نے کبھی چھٹی نہیں منائی اور اس سال یہ اعلان بھی کر دیا تھا کہ وہ پورے پیمانے پر چھٹی منائیں گی۔ خاکسار نے بہتیرا سمجھایا کہ کام میں ہی زندگی ہے اور یہی غنیمت ہے کہ میاں دفتر میں اور بیوی گھر میں مصروف رہے اور بچے آرام سے پلتے رہیں۔ بندہ ناچیز نے یہ بھی عرض کی کہ چھٹی کا خیال ہی مغربی ہے اور ہم ہندوستانیوں کو یہ بات شوبھا نہیں دیتی کہ تیسرے پانچ سالہ پلان کے شروع میں ہی ہم چھٹیاں مناتے پھریں۔

ہم نے تاریخ اور ادب کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بھی کہا کہ مرزا غالب کا

بھی خیال تھا کہ "زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی ہے" اور آج کل پنڈت نہرو بھی آرام کو حرام ملنتے ہیں۔

لیکن بیگم کہاں کی سننے والی تھیں وہ کچھ دنوں کے لیے اپنی محدود زندگی سے بھاگنا چاہتی تھیں۔ کہنے لگیں کہ میں بچوں کی ماں بن بن کر تنگ آگئی ہوں، اور چھٹی لے کر اپنی "عمر گزشتہ کی کتاب" کے کچھ ورق دوبارہ پڑھنا چاہتی ہوں۔ ہمیں بارہا بتایا جا چکا تھا کہ ہم نے ان کے ساتھ "ہنی مون" بھی نہیں منایا تھا۔ لہٰذا اب تو کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا اور کچھ ہو نہ ہو چھٹی تو ضرور ہوگی۔ ایسے عزم کے سامنے بھلا کون ٹھہر سکتا تھا؟ جھکنا ہی پڑا۔

یہ تو فیصلہ اٹل ہو ہی گیا تھا کہ چھٹی منائی جائے گی۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ بچوں کا کیا کیا جائے؟

بڑا بچہ (خدا اس کی عمر اور قد دراز کرے) خیر ہمارے ساتھ ہی چل سکتا تھا۔ لیکن بچی کو ساتھ رکھنا تو چھٹی کا خون کرنا تھا۔

بیگم نے مشورہ دیا کہ بچی کو ان کی بہن کے پاس، جو دلی کے پاس ہی رہتی ہیں، چھوڑ دیا جائے۔ ان کا بھی دل بہل جائے گا اور ہماری بھی چھٹی پوری ہو جائے گی۔

باقی رہا بچی کے ردعمل کا سوال تو دس ماہ کی جان کو کیا خبر کہ کون ماں ہے اور کون خالہ ہے بس وقت پر دودھ کی بوتل اور کچھ کھیل وغیرہ مل جائیں تو ماں ہو نہ ہو برابر (یہ بیگم کا خیال تھا۔ خاکسار کا نہیں۔ ہائے کلجگ کی ماں!)

پھر اتفاق کی بات کہ ایک ضروری کام سے ہمیں انہی دنوں دلی جانا پڑا۔ بس پھر کیا تھا ہماری سالی کو ایک ایکسپریس تار بھیجا گیا کہ فلاں تاریخ کو

ہوائی اڈے پر ملو۔ خاکسار نے بہتیرا پروٹسٹ کیا کہ ہوائی جہاز کا سفر ہے بچی چھوٹی ہے اور پھر کتنی عجیب بات لگتی ہے کہ ہم بریف کیس کے بجائے بچے کو اٹھائے لیے جا رہے ہیں۔

ہم نے اطلاعاً یہ بھی گزارش کی کہ ہم نے کبھی بچے نہیں اٹھائے۔ شادی سے پہلے کبھی بچوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا وغیرہ۔ لیکن یہاں کون سُنتا تھا فرمایا بیگم نے کہ شادی سے پہلے اور بھی کتنی چیزوں کو ہاتھ نہیں لگایا ہوگا۔

لیکن یہ تو کوئی دلیل نہیں ہم نے یہ بتانے کی جرأت نہیں کی کہ ہوائی جہاز کا سفر تو صرف اکیلے ہی کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ اگر ہوائی حسینہ (انگریزی فلموں کے ناموں کے ہندوستانی ترجمے کے طرز پر "ایر ہوسٹس" کا آزاد ترجمہ یہی ہونا چاہیے) نے بچہ ساتھ دیکھ لیا تو پھر اس کے تیور ہی بدل جائیں گے۔ اور ہوائی سفر کا سات بٹا آٹھ لُطف مارا جائے گا۔ لیکن آپ جانیں کہ ایسی وجوہات بیگم کے سامنے تو نہیں رکھی جا سکتیں۔ "نئے جہاز ہیں! موسم اور مطلع صاف ہے اور پھر تین گھنٹے کا سفر صرف تین گھنٹے کے لیے بی بی سٹنگ نہیں کر سکتے۔" بیگم نے گویا ایک چیلنج دیا۔

مختصر یہ کہ ہم جب ہوائی جہاز پر سوار ہوئے تو ہماری دختر نیک اختر بطور سند شادی ہماری گود میں اور ہمارے معمول کے مختصر سے سامان کے بجائے ہمارے ساتھ ہوم جامے، دودھ کی بوتلیں، بسکٹوں کا ڈبہ، تھرمس فلاسک دھونے کا صابن اور صاف کرنے کا برش، پوتڑے اور دوسرے کپڑے اور خدا جانے کیا کیا رکھ دیا گیا تھا۔ ہوائی جہاز چلنے سے بیشتر خود بیگم جہاز میں گئیں

ہوائی حسینہ کو ضروری ہدایتیں دے دیں۔ اور پھر بے بی کے پروگرام کی ایک کاپی اُن کو اور ایک مجھے عنایت فرماتے ہوئے ان سے یوں مخاطب ہوئیں۔

"آپ ہی خیال رکھیں یہ تو خود بچے ہیں۔"

پھر میری طرف مڑ کے بولیں "وہ ہدایات یاد رکھیے۔ ایک کاپی میں نے آپ کے سوٹ کیس میں بھی رکھ دی ہے۔ بس تین گھنٹے کی بات ہے۔"

میں سہما ہوا اپنا سا منہ لے کے بیٹھ گیا۔ کتنا فرق تھا پہلے سفروں میں اور آج کے سفر میں۔ ہوائی حسینہ جو عموماً سب کو چھوڑ کر ہماری طرف ہی رجوع ہوتی تھی، آج دور ہی سے ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، گویا کہہ رہی ہو "بہت بانکے بنے پھرتے تھے۔ آج پتہ چلا کتنی گہرائی تک گرہست میں پھنسے ہوئے ہو"۔ اور ہم کوس رہے تھے اپنی قسمت کو۔ ہوائی سفر کے اس طرح "کرکرا" ہونے کا کبھی خواب میں بھی خیال نہ آیا تھا۔

خیر ہمارے دل پر پڑے ہوئے اتنے بوجھ کے باوجود بھی ہوائی جہاز اٹھا اور آن کی آن میں ان پر رنا کی اونچائی پر پہنچ گیا۔ ہمیں ڈر تھا کہ جب ہوائی جہاز اوپر اٹھے گا تو ہماری بچی چلانا شروع کرے گی جس سے سارے مسافروں کو ہمارے وجود کا علم ہو جائے گا۔ لیکن بچی ایسے آرام اور اطمینان سے بیٹھی رہی کہ جیسے جنم جنم سے ہوائی سفر کرتی چلی آئی ہو۔ اور عام بچوں کی طرح پیدا ہونے کے بجائے سیدھی آسمان سے پیراشوٹ کے ذریعے ٹپکی ہو۔

صرف ایک بار جب ہوائی جہاز تیزی سے کچھ نیچے کی طرف آیا تو سہم کر وہ میرے ساتھ چمٹ گئی — یا شاید یہ کہنا زیادہ دیانت داری ہو گی کہ میں خود سہم کر اس کے ساتھ چمٹ گیا۔ بیگم نے بچی کو ضروریات سے

فارغ کرا کر مجھے بتا دیا تھا کہ پورے ایک گھنٹے کے بعد احتیاط کی ضرورت ہوگی۔

ابھی مشکل سے آدھ گھنٹہ ہی ہوا تھا کہ میں نے سوچا کہ اتنی دیر میں بچی کے پروگرام کی ٹائپ شدہ کاپی ہی پڑھ ڈالوں تاکہ آنے والی ہر صورت کا مقابلہ کر سکوں۔ پروگرام مندرجہ ذیل تھا۔

ساڑھے پانچ بجے صبح:

نیند سے بیداری: بہتر ہے کہ پندرہ منٹ پہلے اٹھ کر بچی کو ہیلو کہنے کے لیے تیار رہو جاؤ۔ ورنہ بے بی کا موڈ بگڑ جائے گا اور اس کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔

پونے چھ بجے:

ضروریات سے فراغت: منہ ہاتھ دھونا کنگھی کر کے تیار کر دینا۔

چھ بجے:

۲ اونس دودھ ابال کر ایک چمچ چینی ڈال کر ۸۹ درجہ حرارت پر پلانا۔ (اگر بچی یہ دودھ ختم نہ کر سکے تو کچھ بیماری کی نشانی ہے)

دودھ پلانے کے فوراً بعد بچی کو اوندھے منہ لٹا کر دو ڈکار دلوانا یہ دودھ ہضم ہونے کی نشانی ہے۔

چھ سے سات:

کھیلنا (یہ ضروری ہے کہ تم اس دوران ہنس مکھ رہو، ورنہ بچی پر برا اثر پڑنے کا ڈر ہے)

ساڑھے سات بجے:

رفع حاجت۔

ساڑھے آٹھ سے ساڑھے بارہ بجے:

نیند:۔

ساڑھے بارہ بجے:

ایک کیلا یا تھوڑا سا دہی چینی کے ساتھ۔

ایک بجے:

دودھ کی دوسری بوتل ڈکار وغیرہ۔

ایک سے دو بجے:

ہنسنا کھیلنا (گدگدی کے سوا باقی سب کچھ جائز ہے)

دو سے پانچ:

نیند۔

ساڑھے پانچ بجے:

دودھ۔

چھ بجے:

رفع حاجت۔

ساڑھے چھ بجے:

کپڑوں کا نیا جوڑا یاؤڈر سے ہاتھ دینے کے بعد

سات بجے:

چاول اور دہی یا سیب کا ٹکڑا یا آدھا ابلا ہوا انڈا یا پورا ابلا ہوا آلو۔

آٹھ بجے:

نیند (سلانے سے پہلے گڈ نائٹ کہنا)

(نوٹ: اگر یہ پروگرام اچھی طرح سے نبھایا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ بچی

کے کپڑے خراب ہوں اور تمہیں کوئی تکلیف ہو۔ بچی باقاعدہ پروگرام کی عادی ہے گر بڑے سب کو تکلیف ہو گی۔ باسکٹ میں چھ بوتلیں، برتن اور صابن ہیں۔ ہر بوتل استعمال سے پہلے ابال لینی چاہیے۔ پانی بھی ابلا ہوا ہلانا۔ چینی اور کچھ بسکٹ ٹوکری میں ہیں ان کا بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔

پروگرام کیا تھا اچھی خاصی پریڈ تھی۔ میں پڑھ کر لرزنے لگا۔ پھر تسلی ہوئی کہ اس پروگرام پر عمل تو میری سالی کو کرنا ہے مجھے کیا جینا! وہ بھی کیا یاد کرے گی کہ کسی رئیس کی بچی سے پالا پڑا تھا۔

ابھی میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ اچانک ایسا محسوس ہوا جیسے پسینے کی دھاریں چھوٹ پڑی ہوں۔ دیکھا تو قمیص ایک سرے سے دوسرے سرے تک پانی پانی ہو رہی تھی ظاہر ہے بچی کا کام تھا۔

گھڑی کی طرف دیکھا ٹھیک ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ غلطی میری تھی۔ کوتاہی ہو گئی۔ لیکن اچھی سزا ملی۔

اب مصیبت تھی کہ جب ہوائی جہاز سے اتروں گا تو قمیص پر بنا ہوا یہ سمندری نقشہ تو بہت شرمناک بات ہو گی۔ اس سے رہی سہی عزت بھی خاک میں مل جائے گی۔

خیر بڑی مشکل سے بچی کے پوتڑے بدلے اور پھر اسے تھپکا کر سلا دیا اب تک ہمارے دونوں بازوؤں کے پٹھے شل ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے جن نازک بازوؤں نے کبھی کسی بچے کو نہ اٹھایا ہو انھیں ایک دم دس ماہ کی ٹھوس بچی کو بیس ہزار فیٹ کی بلندی پر ۳۰۰ میل کی رفتار سے اٹھانا پڑے۔ تو آپ کوشش کریں حساب کے اس سوال کا جواب نکال لیتے کی۔ ایسا معجزہ ہنومان جی مہاراج کے سنجیونی بوٹی کے لیے پہاڑ اٹھا لانے کے بعد تاریخ میں شاید پہلی بار ہی ہوا

تھا کتنا خوش قسمت تھا میں! میرا دل رام بھگتی کے پوتر جذبات سے امڈ آیا۔ جے ہنومان، جے سیتا پتی رام چندر، جے وایو یان، جے وائسکا ؤنٹ، جے بیگم اور جے بیگم کی چھٹی کی!!

یہاں سے چلنے سے پیشتر ایکسپریس تار تو بھیجا جا چکا تھا اور اب میں بے تابی سے انتظار کر رہا تھا کہ کب جہاز نیچے اترے گا اور کب یہ معصوم بوجھ کے حقوق میرے ہاتھوں سے سالی کے ہاتھوں میں منتقل ہوں گے۔ پھر خیال آیا کہ ہو سکتا ہے کہ کنجوس سالی ٹیکسی کا کرایہ بچانے کے لیے ہوائی اڈے پر نہ آئے۔

خیر کوئی بات نہیں، اڈے پر نہیں تو ہوٹل پر تو ضرور آئے گی۔ پتہ لکھ دیا تھا۔ بس ایک آدھ گھنٹے کی اور بات تھی۔

اس طرح اس بار ہوائی حسینہ سے باتیں کرنے کے بجائے میں خود اپنے آپ سے باتیں کر رہا تھا۔ خود کو طفل تسلیاں دے رہا تھا۔

آخر جہاز دلی پہنچا۔ میں بچی اور بچی کے سامان کے ساتھ لدا ہوا دھوبن کے گدھے کی مانند جہاز سے اترا۔ باہر دیکھنے والے لوگ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ اسے سفر کس نے کرنے دیا! لیکن دنیا سے بے خبر میری نظریں اب اپنی سالی کو چاروں طرف ڈھونڈ رہی تھیں اور سالی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ خیر ہم نے ٹیکسی لی اور اپنے ہوٹل پہنچے۔

وہاں جا کر دریافت کیا تو وہاں بھی کوئی نہ آیا تھا۔ اب مجھے گھبراہٹ ہونی شروع ہوئی۔ اگر اسے آنا تھا تو پانچ بجے تک پہنچ جانا چاہیے تھا لیکن اب تو سات بج چکے تھے اور اس کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ پھر ریل کا ٹائم ٹیبل منگوا کر دیکھا تو ایک گاڑی رات کے دس بجے آتی تھی۔ سوچا شاید

کچھ ہو گیا ہو اور بس پر نہ آسکی ہو رات کے دس بجے تک انتظار کر لیں گے۔

پھر میں نے بے بی کا ٹائم ٹیبل نکالا اور ہدایت کے مطابق چاول اور دہی کا آرڈر دے دیا۔ اس دوران میں ایک رسی منگوا کر کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک باندھ دی اور گیلے کپڑوں کو وہاں لٹکا دیا پھر گرم پانی کر کے بوتلوں کو ابالا اور باقی چیزیں صاف کیں۔

اتنے میں چاول اور دہی آگیا اور میں نے بچی کو کھلانا شروع کر دیا۔

بیرا پہلے تو حیرت سے دیکھتا رہا پھر ہمت کر کے بولا:

"صاحب یہ بچی کس کی ہے؟"

"میری۔"

"آپ کی...... اور اس کی ماں؟"

"اس کی ماں میری بیوی ہے۔"

بیرا ذرا جھینپ گیا۔ لیکن خرانٹ قسم کا تھا پھر بولا:

"لیکن اسے آپ ماں کے بغیر کیوں لے آئے؟"

بیگم وہاں ہوتیں تو اچھا جواب دیتیں "تم انیسویں صدی کے لوگ کیا جانو؟ والدین اور بچوں کو کبھی کبھار ایک دوسرے سے چھٹی لینا چاہیے وغیرہ وغیرہ۔" لیکن میں اس بلا کو ٹالنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا کہ اس کی ماں بیمار تھی اور بچی کو الگ رکھنا تھا اس لیے اپنی موسی کے پاس جا رہی ہے۔

مجھے محسوس ہوا کہ اس جواب سے بیرے کی تسلی نہیں ہوئی وہ سمجھا ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ پھر بھی از راہِ مہربانی مجھے میرے حال پر چھوڑ کر چلا گیا۔

رات کے دس بجے گیارہ بجے لیکن سالی ندارد۔ اس کے آنے کی آس

یں میں نے اور پلنگ بھی نہیں منگوایا تھا۔ باپ کے پیش نظر مشکلات سے بے خبر بچی میرے پلنگ پر خراٹے لے رہی تھی۔

آخر میں نے امید چھوڑ کر بچی کے پلنگ کو چاروں طرف سے کرسیوں اور میزوں سے محفوظ کر دیا۔ تاکہ وہ نیچے نہ گر پڑے، اور خود نیچے غالیچے پر سو گیا۔

صبح جب نیا بیرا آیا تو بچی کو میرے ساتھ دیکھ کر بوکھلا سا گیا۔

"صاحب یہ بچی.......؟"

"ہاں یہ بچی۔"

"اس کی ماں کو کیا ہو گیا؟"

جس جواب کی امید اس کو تھی وہ نہیں دیا جا سکتا تھا۔ بچی کی ماں زندہ تھی۔ اس نے طلاق نہیں لی تھی... پھر یہ بچی اس حالت میں اکیلے باپ کے ساتھ کیسے؟

جواب دیتا تو نہ جانے کب چھٹکارہ ملتا۔ میں بس مسکرا دیا اور بیرا بھی سب کچھ غلط سمجھ کر میرے ساتھ ہمدردی جتاتے ہوئے مسکرا دیا۔

اس کے بعد کسی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔ ظاہر ہے کئی دلچسپ افسانے بن چکے ہوں گے اور افواہ کی طرح آوارہ گردی کر رہے ہوں گے جس طرف میں جاتا تھا لوگ ہمدردی سے دیکھتے تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ہوٹل میں ایک قسم کا ہیرو سا بن رہا تھا۔

اب مجھے فکر تو اس بات کی تھی کہ جس میٹنگ میں مجھے جانا تھا اس کے لیے وقت کیسے نکالا جائے؟

ایک بیرے کو بلا کر میں نے درخواست کی کہ اگر وہ صرف تین گھنٹے تک بچی کی نگرانی کرے تو میرا کام بن جائے گا۔ تب تک تو انشاء اللہ کمبخت سالی بھی آن

ٹپکے گی۔

اب چونکہ بچی کے پروگرام پہ مجھے عمل کرنا تھا اس لیے پروگرام کی ایک کاپی میں نے دیوار کے ساتھ چسپاں کر دی۔ اب کمرہ ایک اچھا خاصہ نرسری بن گیا تھا۔

جب میٹنگ سے واپس آیا تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ بہ قول بیرا بچی بہت سنبھلی ہوئی اور نہایت ہی سمجھ دار تھی۔ اس نے کہا بالکل باپ پر گئی ہے۔ اور اس تعریف پہ مجھے شکریہ ادا کرنا پڑا۔ آپ جانتے ہیں کہ بیروں کا شکریہ صرف نوٹوں کی صورت میں ادا کیا جا سکتا ہے۔ دو روپے کا نوٹ لے کر بیرا واپس چلا گیا۔ ظاہر ہے بچی واقعی بہت اچھی تھی۔ (یا اس کی ماں بہت خراب تھی) اپنی ماں کے لیے بالکل اداس نہیں ہوئی۔ اس سے میری خود اعتمادی اور بھی بڑھ گئی اور اب میں نے اس اطمینان سے بچی کو بہلانا شروع کیا گویا پشتوں سے یہی کام کرتا آیا ہوں۔ کوئی اجنبی دیکھتا تو ضرور سمجھتا کہ میں امریکہ ریٹائرڈ بیبی سٹر ہوں یا بچے بہلانے والا ہوں۔

ایسے میں زندگی کے تین لمبے دن اور گزر گئے۔ سالی صاحبہ کو نہ آنا تھا اور نہ آئیں۔ ہوٹل والوں کا شک یقین میں بدل گیا کہ میری کہانی من گھڑت تھی اور معاملہ ضرور سنگین قسم کا تھا۔ جدھر سے میں گزرتا انگلیاں اٹھنا شروع ہو جاتیں۔ کھلے طور پر چہ میگوئیاں شروع ہو گئیں۔

پہلے تو میں نے بات جانی انجانی کر دی پھر رفتہ رفتہ مجھے غصہ آنا شروع ہو گیا پہلے غصہ لوگوں پر آیا کہ یہ سمجھتے کیوں نہیں، پھر سالی پر آیا کہ وہ آئی کیوں نہیں اور سب سے آخر میں بیگم پر غصہ آیا جن پر نہ جانے کیوں ایکدم چھٹی منانے کا بھوت سوار ہو گیا تھا۔ جب تک بیگم کی باری آئی تو غصہ جیسے کہ اکثر ہوتا ہے، بہت تیز ہو گیا تھا۔ میرا خون کھولنے لگا اور میں نے فیصلہ کیا کہ بیگم کو اب ایسا مزہ

چکھاؤں گا کہ چھٹی رہی ایک طرف چھٹی کا دودھ یاد آجائے گا۔

میں نے تین دن تک اتنی ہمت، بہادری، دلیری، بردباری اور ممتا ملکہ بیتا سے بچی کو پالا کس لیے؟ صرف اس لیے کہ بیگم چھٹی پر جا سکیں جیف ایسی چھٹی پر جس کے لیے بھلے چنگے خاوند کو آیا بننا پڑے!

آخر چوتھے دن میٹنگ کے خاتمے پر میں نے تار دے دیا کہ ایک مہمان کے ساتھ واپس گھر آرہا ہوں۔ اگلے دن میں بچی اور جملہ شدہ سامان کے ساتھ (آپ کو یہ سن کر حیرانی اور خوشی ہوگی کہ چھ بوتلوں میں سے ایک بھی نہیں ٹوٹی تھی) واپس گھر پہنچ گیا۔ یہاں جب ساری رام کہانی سنائی تو مارے ہنسی اور حیرت کے بیگم کا برا حال تھا۔

دوسرے دن ہماری سالی کا بھی تار آگیا "بچی کو کب لا رہے ہو سب انتظار کر رہے ہیں" ظاہر ہے کہ ہمارا تار نہیں ملا تھا۔ اب معاملہ بیگم ان کی بہن اور محکمۂ تار کے درمیان تھا۔ بہرحال بیگم کی چھٹی شہید ہو چکی تھی اور مجھے ایک خفیہ قسم کی عجیب سی خبیث خوشی محسوس ہو رہی تھی بیگم کی پہلی چھٹی کے اس حشر پر۔

رہے نام اللہ کا جس نے کم از کم اس افسانے کے ختم تک تو بیوی پر خاوند کی شان مضبوط کر دی۔

ہم ایڈیٹر بنے

ہم نہیں جانتے کہ ہمارے وجود میں لائے جانے کے لیے ہمارے والدین کے کون کون سے ارمان ذمہ دار تھے۔ تاہم لڑکے اور لڑکیوں کی ایک لمبی زنجیر کی تقریباً درمیانی کڑی کے روپ میں جب ہم نمودار ہوئے تو خاندانی مورخوں کے بیان کے مطابق کافی خوشیاں منائی گئیں۔ چوں کہ ہمارے وجود میں لائے جانے کے لیے ہماری رضامندی نہیں لی گئی تھی۔ اس لیے سنا ہے کہ ان تمام شادی کے نغموں کے درمیان ہمارے رونے کی بے سُری راگنی بھی سُنی گئی۔

ہمارے ساتھ گھر والوں کے کیا کیا ارمان وابستہ تھے، اس کا ہمیں اس وقت پتہ چلا جب ہم نے ابتدائی تعلیم ختم کر کے اعلیٰ تعلیم شروع کرنے کی سوچی۔ آج کل کے مہارت پسندی کے دور میں اعلیٰ تعلیم شروع کرنے سے پہلے یہ فیصلہ کرنا ضروری ہے کہ ہمیں زندگی میں کیا بننا ہے۔ والد صاحب کا خیال تھا کہ اسکول ٹیچری یا پروفیسری جیسا کوئی شریفانہ اور بے ضرر پیشہ اختیار کرنا

چاہیے جس سے زندگی بھی چین سے گزرے اور عاقبت بھی سنور ے۔ ہمارے بے شمار چچاؤں اور دوسرے بزرگ صلاح کاروں کا خیال تھا کہ ڈپٹی کلکٹری یا وکالت جیسے سود مند کام کے لیے تیاری کی جائے۔ تاکہ "اپنے لوگوں" کو بھی کچھ فائدہ ہو۔ دوسری طرف ماموؤں کی ایک صف تھی جن کے نیک خیال کے مطابق اشرف المخلوقات کے لیے انجینیرنگ سے بہتر کوئی اور پیشہ نہ تھا۔ دوسرے لفظوں میں احباب کی نظروں میں ڈپٹی کلکٹری اور انجینیرنگ کے درمیان کوئی اور انتخاب ناممکن تھا۔ ہماری نانی صاحبہ (خدا ان کو تیرہ سال تین ماہ اور سلامت رکھے تاکہ وہ سو سال کی ہو جائیں[1]) اپنے تجربے کی بنا پر مصر تھیں کہ اے جی (اکاؤنٹنٹ جنرل) کے دفتر میں کلرکی کر لینی چاہیے کیوں کہ اس طریقے سے ایک دن یہ ممکن تھا کہ ہم بہ ذاتِ خود اے، جی کی کرسی پر براجمان ہو جائیں۔

انھیں کی بچی یعنی ہماری والدۂ محترمہ کا خیال تھا کہ ہمیں ڈاکٹر بننا چاہیے۔ شاید وہ غیر ارادی طور پر سمجھتی تھیں کہ ہندوستان کی بے پناہ آبادی کو کم کرنے کا صرف یہی ایک مؤثر طریقہ تھا۔

ادھر تو بزرگوں میں اپنے ہونہار نونہال کے بارے میں جنگ نما بحث ہو رہی تھی اور ادھر ہمیں ایک اور ہی دُھن لگی ہوئی تھی۔ ان دنوں آزادی کی جدوجہد زوروں پر تھی اور ہم نے ایک ایک کر کے تمام لیڈروں کی سوانح عمریاں، تذکرہ جات حیات، آپ بیتیاں اور اخباری بیانوں تک کو پڑھ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا تھا کہ اگر کوئی پیشہ اپنانے کے قابل ہے تو وہ ہے اخبار نویسی۔

ہمیں بزرگوں نے ہر چند روکا کہ کیوں جان بکار روگ مول لیتے ہو۔ اقبال

---

[1] ہمیں افسوس ہے کہ ہماری یہ دعا قبول نہیں ہوئی اور کتابت کے دوران ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

کے عشق کی طرح ایڈیٹری بھی سب بل نکال دے گی۔ ماں باپ نے کہا کیوں گاڑھے پسینے کی کمائی حرام کرتے ہو؟ صحافت تو چٹان میں خالی کنواں کھودنے کا کام ہے یار دوستوں نے کہا زندگی گنوانی ہے تو ایڈیٹری سے بہتر ہے عشق کر لو شاید کچھ نہ کچھ حاصل ہو جائے۔

ہر کس و ناکس نے یہی مشورہ دیا کہ بچو بچو لیکن ہم تھے کہ "زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد" کے مصداق اپنے ارادے پر اٹل۔ آخر چار و ناچار سب جھک گئے اور ہم نے دو چار دوستوں کو ساتھ لے کر "مستقبل" کے نام سے ایک روزنامہ جاری کر ہی دیا۔

پہلے تو اخبار والوں کو اپنی ساکھ جمانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے شروع میں اخبار کی کاپیاں تحفے کے طور پر بھیجنا پڑتی ہیں۔ ملّا کی مفت کی مرغی کی طرح COMPLIMENTARY کاپی کیسے حرام ہو سکتی ہے! ہم پیشہ ایڈیٹروں، افسران بالا، پولیس، محکمۂ اطلاعات اور بے شمار دوستوں اور ایجنٹوں کو ملا کر مفت خوروں کی تعداد کوئی دو ہزار کے لگ بھگ ہو جاتی ہے۔ کبھی کسی شناسا سے اخبار خریدنے کے لیے کہیے تو گویا بڑا احسان کر کے اعلان کرتے "عزیزم ہم تو صرف اعزازی کاپی لیں گے"۔ جن کو ایک بار اخبار مفت بھیجا، ان کے منہ کو تو گویا خون لگ گیا۔ کیا مجال کہ ان کی کاپی پھر بند کر سکیں۔ اور جب کسی ناآشنا سے کچھ بات ہوتی تو فرماتے کہ جب تک کچھ کاپیاں دیکھ نہ لی جائیں خریدار بننا دانشمندی نہ ہوگی۔ غرض یہ کہ ہماری اعزازی خریداروں کی فہرست تو حاملہ کے پیٹ کی طرح روز بروز بڑھتی ہی گئی اور ہماری فروخت وفادار بیوی کی طرح اپنی جگہ قائم۔ چھ مہینوں کے اندر ہی تمام پونجی ختم ہو گئی۔ اور اخبار چلانا تو خیر ایک طرف رہا پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے پیسہ ملنا مشکل دکھائی دینے

لگا۔ دوستوں کے مشورے سے محکمۂ اطلاعات کی طرف اشتہاروں کے لیے ہاتھ بڑھایا تو جواب ملا کہ جب تک آپ کی سرکولیشن نہیں بڑھتی آپ کو اشتہار نہیں دیئے جا سکتے۔ واہ صاحب عجیب معاملہ ہے۔ اشتہار تو اس لیے چاہیے کہ اشاعت زیادہ نہیں، اگر اشاعت زیادہ ہوتی تو اشتہاری امداد کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب ان اطلاعات کے اربابِ اقتدار کو کون سمجھائے۔ اخبار والوں کی مشکلات کے بارے میں! وہ تو خدا کا شکر ہوا کہ عین اسی وقت ایک امیر بزرگ ہمارے کنوارے پن کی وجہ سے ہمارے "مستقبل" میں دلچسپی لینے لگے اور ہماری مالی پریشانیاں کچھ عرصے کے لیے دور ہو گئیں۔

چونکہ ہم نے یہ اصول بنایا تھا کہ صرف سچی اور مستند خبریں ہی شائع کریں گے اس لیے اب سوال یہ تھا کہ اخبار کے لیے مواد کہاں سے لیا جائے؟ سوشل کالموں کے لیے ضروری تھا کہ جلسوں، محفلوں اور دعوتوں میں جایا جائے لیکن بغیر دعوت نامے کے اپنی خودداری کو جیب میں رکھ کر یہ کیسے ممکن تھا۔ جب کبھی دعوت نامے کے لیے گول مول الفاظ میں کسی سے اشارہ کرتے تو وہ یہی سمجھتے کہ ہم نے ایڈیٹری شروع ہی اس لیے کی ہے کہ چائے پانی کا بندوبست ہو جائے۔

بارہا ایسا بھی ہوا کہ کسی لیڈر کے بیان کو شائع کیا تو فون پر احتجاج ہوا "واللہ آپ نے یہ کیا کر دیا؟ بالکل اوٹ پٹانگ لکھ مارا" جب ہم نے عرض کیا کہ خبر تو آپ کے بیان پر مبنی ہے تو فرمایا "یہ صحیح ہے، لیکن کہنے کو تو بہت کچھ کہہ دیا جاتا ہے، لکھتے وقت تو ذرا احتیاط اور ذمہ داری سے کام لینا چاہیے" لیجیے! یہ بھی خوب رہی۔ بیان کوئی دیتا پھرے اور احتیاط اور ذمہ داری دکھائے کوئی اور!

اور پھر افسانے، کہانیوں اور نظموں وغیرہ کا شعبہ کیا ہے؟ سراسر تکلیف کا گھر! میز خرافات سے آئی پڑی ہے اور معلوم نہیں پڑتا کہ کسی کس چیز کو رد کیا جائے۔ بس ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ نام اخبار میں آجائے اور پیسہ جیب میں۔ کل ہی کی بات ہے کہ ایک صاحب آن دھمکے۔ فرمانے لگے۔

"آپ نے اعلان کیا تھا کہ آپ افسانے شائع کریں گے۔ میں نے آپ کو کتنے ہی افسانے بھیجے اور آپ نے کوئی بھی نہیں شائع کیا آخر یہ کیا معاملہ ہے؟"

"آپ کو جواب مل گیا ہوگا؟" میں نے کہا۔

"واہ صاحب، جواب کی بھی ایک ہی کہی کوئی وجہ تو بتائی ہوتی۔" وہ صاحب جھنجلا کر بولے۔

ہم نے عرض کیا "یہ صرف دل رکھنے کی بات ہے کہ وجہ نہیں بتائی جاتی، ورنہ آپ کو کیا یہ لکھا جائے کہ آپ کا مضمون بیہودہ ہے، زبان غلط ہے یا آپ بالکل واہیات لکھتے ہیں......!"

خیر یہ تو روز کا معمول ہے۔ اب اتنے تھوڑے عرصے میں آپ کے سامنے کیا کیا رونا رویا جائے۔

ہم سمجھتے تھے کہ یہ ابتدائی مشکلات ہوتی ہیں آہستہ آہستہ دور ہو جائیں گی لیکن یہاں تو نت نئی مصیبتوں کا سامنا پڑتا ہے۔ غالب کی شاعری کی طرح ہماری ایڈیٹری "ذریعۂ عزت" تو کجا "ذریعۂ معاش" بھی نہ بن سکی لیکن اب تو اس راہ پر ہم اتنی دور نکل آئے ہیں کہ نہ آگے چلتے بنتی ہے نہ ہی پیچھے ہٹتے!

ہماری زبان میں ایک پرانی کہاوت ہے کہ آم کے کھانے اور بزرگوں

کی نصیحت کی مٹھاس کا پتہ کچھ دیر کے بعد لگتا ہے۔ غمِ دوراں نے بارہا ہمیں نانی کی یاد دلائی اور کمزور لمحوں میں ہمیں ان کی وہ نصیحت یاد آئی کہ بیٹا اے، جی کے دفتر میں کلرکی کرلو۔ اب کئی بار سوچتا ہوں کہ اگر ان کی نصیحت مان لی ہوتی تو اب تک اے۔جی نہیں تو کم از کم اکاؤنٹنٹ تو ضرور بن گئے ہوتے۔

لیکن یہ تو کمزور لمحوں کی بات ہے اور کمزور لمحے تو آپ جانتے ہیں کمزور ہی ہوتے ہیں!

بند کواڑ

وہ پانچ سال کے بعد وطن واپس آیا تھا۔ یکے بعد دیگرے وہ کئی شہروں کی ایسی جگہوں پر گیا جہاں اس نے زندگی کے حسین لمحات گزارے تھے۔ مگر نہ جانے کیوں ہر جگہ اسے اُداسی نظر آئی۔ جہاں پہلے ہر طرف مسکراہٹیں ہی مسکراہٹیں نظر آتی تھیں، اب ویرانی سی تھی۔ شہر وہی تھے، جگہیں وہی تھیں۔ وہ کیا چیز تھی جو پانچ سال پہلے اس کو وہاں نظر آئی تھی اور اب نہیں تھی؟ جس کی وجہ سے زندگی میں کچھ خلا سا محسوس ہو رہا تھا۔ ویسے تو ہر جگہ کافی ترقی کے آثار نظر آتے تھے۔ لیکن ترقی اور چیز ہے اور رونق اور چیز۔ ایسا لگتا تھا جیسے شہروں نے سودا کر لیا ہو کہ لے جاؤ ہماری ساری رونق اور ہمیں ترقی یافتہ بنا دو۔ جگہ جگہ نئے مکان بھی نظر آتے تھے۔ ایسے مکان جو لوگ کرایہ حاصل کرنے کے لیے بناتے ہیں، خود رہنے کے لیے نہیں۔ پیسے بنانے کا ایک اور دھندا۔ ڈربوں میں کنبوں کو گھسیڑ دو، اور پھر یہ امید کرو کہ وہاں انسانی زندگیاں پھولیں پھلیں گی۔ لیکن یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں تھی۔ لایا تو

تب بھی تھا۔ ہاں پانچ سال میں لوگ بدل گئے تھے، کالج کے سب طلبا نکل چکے تھے اور جو نئے بچے فرسٹ ایر میں فیل بنائے جاتے تھے وہ بھی اس بڑی دنیا میں روزی کی تلاش میں نہ جانے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے۔ بیشتر پروفیسر ریٹائر ہو چکے تھے اور جو لوگ اسے اچھی طرح جانتے تھے وہ بھی کچھ ٹھنڈے ٹھنڈے نظر آرہے تھے۔ اداسی اس کے چاروں طرف تھی۔ اس ویرانہ میں اسے اپنی تنہائی کا شدید احساس ہوا۔ کیا دنیا واقعی بدصورت اور بے رونق ہو گئی ہے۔ یا یہ سب میرے دل کا عکس ہے ؟ اس نے اپنے آپ سے سوال کیا۔

بہرحال یہاں بھی اس کا دل نہیں لگا۔ پھر اس نے سوچا چلو رام پور چلتے ہیں۔ وہاں شاید دل لگ جائے۔ پانچ سال پہلے رام پور جنت نشان تھا، اب بھی ویسا ہی ہوگا۔ وہاں اس کے چچا رہتے تھے۔ اپنے چھوٹے سے کنبے کے ساتھ۔ ان کے گھر میں ہمیشہ اسے عجیب سی تسکین اور شانتی ملتی تھی۔ اس گھر میں اس کی بہت عزت تھی۔ سب لوگ اسے ایک چھوٹا سا دیوتا سمجھتے تھے۔ جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی چوری نہیں کرتا، کبھی کوئی پاپ نہیں کرتا، کبھی کوئی غلطی کر ہی نہیں سکتا۔ اُسے ایک عجیب سی غیر مرئی شخصیت کا حامل سمجھا جاتا تھا۔ سارے کنبے کا دوست ہر کوئی اسے اپنا خاص صلاح کار تصور کرتا۔ اور اس کی صلاح کے بغیر کوئی کام نہ کرتا۔ ستیش اس سے بے پناہ محبت کرتا۔ چھوٹی بہن !کیا نام تھا اس کا ؟ ــــ رتیا اسے اپنا ہم جولی سمجھ کر اس کے ساتھ ہر قسم کا کھیل کھیلتی، اور رتنا کے ساتھ اسے گہرا اُنس تھا۔ رتنا نے ابھی کالج میں قدم رکھا ہی تھا اور حالاں کہ عمر میں اس سے قدرے چھوٹی تھی لیکن تھی بڑی سلجھی ہوئی اور سمجھ دار لڑکی۔ اس سارے کنبے میں صرف وہی لڑکی اسے دکھائی دیتی تھی جو کچھ سوچ وچار کر سکے۔ باقی سب لوگ تو بڑے ماڈرن قسم کے دقیانوسی لوگ تھے جو یہ مانتے تھے کہ ایشور اپنی جگہ سکھی ہے اور جو ہوتا

ہے سو ہوتا ہے۔ ان کے دماغ کے سوچ وچار کے دائرے ان حدوں میں محدود تھے جو ہزاروں برس پہلے منو مہاراج مقرر کر گئے تھے اور وہ انھیں حدود میں خوش تھے۔ اس گھر میں ونود کو صرف رتنا ہی ایسی نظر آتی تھی جو سمجھ سکتی تھی کہ کنوؤں کے باہر بہت سارے وسیع تالاب بھی ہیں، دریا ہیں، سمندر ہیں وہ بارہا اس کی مدد سے ان کے خیالات اور ان کے نقطۂ نظر کو پرانے راستوں سے ہٹا کر نئے راستوں پر لانے کی کوشش کرتا لیکن رتنا کی بساط ہی کیا تھی ؟ فرسٹ ایر کی چھوکری۔ اور وہ بھی تو اسے ایسا ہی سمجھتا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا جیسے وہ ایک چھوٹی سی بچی ہو اور وہ سالارِ کارواں۔ اسے یہ کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ ان کا آپس میں "کزن" ہونے کے علاوہ کوئی اور رشتہ بھی ممکن ہو سکتا ہے ؟

ان دنوں ونود نے ابھی پڑھائی ختم ہی کی تھی اور کسی نوکری کی تلاش میں تھا اس کے دل میں قوم کی خدمت کرنے کا، اسے ابھارنے کا بے پناہ جذبہ تھا۔ اس لیے وہ اِدھر اُدھر کی کئی سوسائٹیوں کا کرتا دھرتا بن بیٹھا۔ ویسے وقت گزارنے کے لیے وہ ایک کالج میں دو گھنٹے روز پڑھانے بھی چلا جایا کرتا۔ اس کے کالج کے اوقات ایسے تھے کہ وہ سب کے بعد جاتا اور سب سے پہلے گھر واپس آجاتا۔ صبح جب لوگ اپنے اپنے کاموں کو جاتے تو وہ گھر میں ہوتا اور شام کو جب وہ واپس آتے تو بھی وہ گھر میں ہوتا۔ اسی لیے سب لوگ اسے چھیڑنے کے لیے کہتے کہ وہ تو کوئی کام ہی نہیں کرتا۔ انکل اکثر کہتے بھیّا جو کام سے خالی ہیں وہی سوشلسٹ ہو سکتے ہیں۔ ہمیں کام سے فرصت ہی کہاں ملتی ہے جو تمہاری طرح قوم کی ترقی کے بارے میں سوچیں۔

جب وہ کالج سے واپس آتا تو ڈرائنگ روم میں ریڈیو لگا کر بیٹھ جاتا اور دوسرے لوگ بھی وہیں آجاتے پھر ایک دو بجے کھانا لگ جاتا اور اس کے بعد سب لوگ واپس اپنے کام پر چلے جاتے یا اپنے بلوں میں۔ پانچ بجے کے قریب چائے کے لیے سب لوگ اکٹھے ہو جاتے۔

شام کو وہ عموماً اکیلا ہی باہر جاتا کبھی تو لمبی سیر ہوتی کبھی پرانی کتابوں کی تلاش اور کبھی کسی کونے میں بیٹھ کر زندگی کے مسئلوں پر گھنٹوں غور کرتا۔ کبھی کبھی وہ لوگ اسے تھیٹر، لکچر وغیرہ لے جاتے۔ حالانکہ وہ اس پروگرام سے ہمیشہ کتراتا۔ زندگی ایسے ہی گزر رہی تھی۔ ندیا کنارے کنارے جا رہی تھی اور پانی میں موجوں کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔

شہر وہی تھا گھر وہی تھا ــــ اور لوگ بھی وہی تھے لیکن پانچ سال کے عرصے میں بچے تو بڑے ہو گئے ہوں گے۔ رتنا کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اتنی دور سے وہ شادی میں نہ آسکا تھا صرف ایک مختصر سا تار بھیج دیا تھا "جیون میں دیپ جلتے رہیں، راستوں میں پھول کھلتے رہیں"۔ اسے یہ بھی پتہ چلا تھا کہ اس کے نہ آنے سے ان لوگوں نے بہت برا منایا تھا۔ انھیں ہرگز یہ امید نہ تھی کہ زمانے کے ساتھ وہ بھی بدل جائے گا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ بدلا نہیں۔ وہ کبھی نہیں بدلے گا۔ اب بھی وہ صرف ایک مسکراہٹ کے ساتھ تمام غلط فہمیاں دور کر دے گا۔ سنا تھا رتنا بھی وہیں آئی ہوئی تھی۔

گھر کے باہر کار کھڑی تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ سب لوگ گھر میں تھے۔ برآمدے میں ایک کتا بیٹھا ہوا تھا۔ "ارے!" اسے اچانک یاد آگیا۔ یہ تو وہی کتا ہے۔ کیا نام تھا اس کا؟ کوئی بڑا موٹا سا تاریخی نام تھا۔ اب تو بیچارہ بوڑھا ہو گیا تھا۔ بے چارے کتوں کی عمر ہی کیا ہوتی ہے؟ یہی دس بارہ سال اور یہ کتا اب کم از کم آٹھ سال کا تو ضرور ہوگا۔ کتا اٹھا اور اس کی طرف بڑی سست قدمی سے بڑھا۔ اسے کتوں سے ہمیشہ ڈر لگتا تھا۔ پتہ نہیں بھونکتے ہی حملہ کر دیں۔ اور اگر نہ بھی کاٹیں تو بھی افراتفری میں انسان کی ساری "ڈگنٹی" یک دم درہم برہم ہو جاتی ہے۔ لیکن کتے کی دم ہل رہی تھی۔ تو کیا وہ پہچان گیا تھا؟ خود کو اسے سخت ندامت کا احساس ہوا کہ اسے تو کتے کا نام بھی یاد نہیں رہا اور کتے نے پانچ سال کے بعد بھی

ایک دم اسے پہچان لیا۔ اپنی خفت چھپانے کے لیے اس نے بڑی شفقت سے کتے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ اور اس کو ساتھ لیتے ہوئے برآمدے تک پہنچ گیا۔ کال بیل کا بٹن دباتے ہی ساتھ والے کمرے سے کسی کے اٹھنے کی آواز آئی پھر دروازہ کھلا اور اندر سے کسی نوجوان نے جھانکا۔ اس نے ایک لمحے کے لیے ونود کو غور سے دیکھا اور پھر "ارے آپ" کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔ اچھا تو یہ ستیش تھا۔ "اماں یار تم تو پورے مرد بن گئے ہو کیا کمال کیا ہے!"

ستیش اسے اندر لے گیا۔ انکل نے کتاب سے نظر ہٹا کر ونود کو دیکھا لیکن معلوم ہوتا تھا وہ اسے پہچان نہ سکے۔ "ونود بھیا" ستیش نے اعلان کر کے انکل کا کام آسان کر دیا۔ "اچھا اچھا" کہہ کر انکل اٹھے اور ونود کے کندھے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے "ہونہہ" کہہ کر گویا بہت کچھ کہہ دیا۔ ونود نے دیکھا اس کے سامنے کھڑا ہوا آدمی اب جوان نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ان کے بال پک گئے تھے۔ آنکھوں کی چمک ختم ہو گئی تھی۔ ہلکی سی کھانسی میں زندگی کی آواز کم اور موت کی زیادہ تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ انکل زندگی کو کہیں پیچھے بھول آئے ہیں۔ اب وہ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی پڑتے ہیں۔ ان سے مل کر اسے خوشی کے بجائے شدید غم کا احساس ہوا۔

"گھر کے باقی لوگ کہاں ہیں؟" ونود نے گھر کے سونے پن کو محسوس کرتے ہوئے پوچھا۔ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے تھے۔ ہسپتال! خیر تو ہے نا؟ اوہو تو رتنا کے بچہ ہوا ہے۔ صرف دو ہی دن ہوئے ہیں۔ آنٹی اور بے بی وہیں ہیں تو اسی لیے گھر سونا لگ رہا ہے۔

"چلو ہسپتال چلیں۔" ونود نے مشورہ دیا۔۔۔

لیکن اب تو بہت دیر ہو چکی تھی اور ملنے کا وقت ختم ہو چکا تھا صبح چلیں گے۔ انکل نے صلاح دی اور ضمیر نوکر کو بلا کر ونود کے لیے کھانا بنانے کو کہا۔ وہ سب لوگ۔۔۔

کھانا کھا چکے تھے۔ اسے صرف اپنی خاطر کوئی بھی اہتمام پسند نہیں تھا۔ اس نے کہنا چاہا نہیں ابھی مجھے بھوک نہیں۔ پھر سوچا کون سنے گا میری بات۔ چلو جو بھی ملے گا کھا لوں گا۔

رات سونے کے وقت پھر اسے گھر کے سونے پن کا احساس ہونے لگا۔ یہ کیا ہو گیا ہے ان لوگوں کو۔ اتنے بور کیوں دکھائی پڑتے ہیں یہ سب لوگ۔ یہ سب گزشتہ پانچ سال کی برکت ہے کیا؟ شاید وہ بھی دوسروں کے لیے اتنا ہی بدل گیا ہو۔ تبھی تو اسے ایک دم پہچانا نہیں جا سکا۔ نہیں یہ سونا پن صرف آنٹی اور رتنا کی غیر حاضری کی وجہ سے ہے مان سے مل کر سب کچھ دور ہو جائے گا۔ ان کے واپس آنے پر گھر میں پھر رونق آ جائے گی۔ سب کچھ خود ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ دو چار دن یہاں رک جائے گا۔ شاید اس کی اداسی کچھ کم ہو جائے۔

صبح ایک سرسری قسم کے بریک فاسٹ کے بعد وہ انکل کے ساتھ ہسپتال گیا انکل کو کسی ضروری کام سے کہیں اور جانا تھا اس لیے وہ اس کے ساتھ اندر نہ جا سکے۔ اسے انھوں نے گیٹ پر ہی اتار دیا اور کمرے کا نمبر بتا کر کار آگے بڑھا دی۔ ونود نے سوچا کیا ضروری کام ہو گا انکل کو جو وہ پانچ منٹ کے لیے بھی نہیں آ سکے۔ جوں جوں انسان بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اس کے ضروری کام بھی بڑھتے جاتے ہیں۔ اس نے انکل کو بلانا چاہا لیکن پھر سوچا چلو جانے دو۔ ویسے بھی کار کافی دور جا چکی تھی۔

کمرہ اسپیشل وارڈ میں تھا۔ پاس جا کر اس نے دیکھا دروازہ ادھ کھلا تھا۔ اس نے دروازے کے شیشے پر اس نے انگلی سے تین چار بار ٹک ٹک کی اندر سے آواز آئی "کون؟ ــــ آ جائیے۔" یہ آنٹی کی آواز تھی۔ یہ پانچ سال کی مدت تھی جس نے آواز میں کچھ کمزوری کا اثر ڈال دیا تھا! یا شاید ہسپتال میں اور خاص کر اسپیشل وارڈ میں لوگ آہستہ ہی بولتے ہیں تندرست آدمیوں میں بھی زندگی کچھ دبی دبی سی رہتی

ہے۔ ہسپتال میں بیماری کا علاج ہوتا ہے۔ تندرستی کو تو صرف اس شرط پر داخلے کی اجازت ملتی ہے کہ وہ زیادہ شور نہ کرے۔ شاید وہ سمجھی ہوں کہ ڈاکٹر ہے یا مارننگ نرس یا بیرا۔ کچھ بھی ہو اس ٹک ٹک سے انھیں یہ تو نہیں معلوم ہو سکا ہوگا کہ باہر "وہ" کھڑا ہے۔ پانچ سال بعد اکیلا۔ اس کے دل کی دھڑکن کچھ تیز ہوئی۔ اس نے دروازہ کھولا اور آہستہ سے اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ وہ اندر داخل ہو گیا۔

ایک لمحہ کے لیے آنٹی نے اسے بیگانہ پن سے دیکھا اور پھر "ارے تم کہاں سے آن ٹپکے۔ نہ خط نہ پتر ـــــ وہی پرانی عادتیں۔" ونود نے ہاتھ جوڑ دئے۔ دائیں طرف پلنگ تھا جس پر رتنا لیٹی ہوئی تھی۔ رتنا کا صرف منہ اور بازو دکھائی دیتے تھے۔ باقی جسم سفید چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ چادر وہ شاید گھر سے لائے ہوں گے ہسپتال کی چادر اتنی سفید اور اتنے اچھے کپڑے کی نہیں ہو سکتی۔ اس نے رتنا کی طرف مڑتے ہوئے ایک ہی نظر میں رتنا اور اس کے بچے کی طرف دیکھ کر لمبا سا "ہلو" کہا۔

رتنا کے جوان چہرے پر ایک مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ اب بچی نہیں تھی بچے کی ماں تھی۔ اس کی مسکراہٹ نے ونود سے کہا۔ دیکھا اب میں کتنی بڑی ہو گئی ہوں۔ اب تو میں تمہارے برابر کی ہو گئی نا؟

آنٹی نے ونود کو کندھے سے ہلاتے ہوئے کہا "... لیکن۔ اب تم ـــ بالکل رتنا کی طرح ہے" ــ اور یہ کہہ کر آنٹی نے رتنا کا منہ چوم لیا۔

وہ جھکا اور کپڑوں میں لپٹی ہوئی اس ننھی سی ... زندگی کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس عمر میں سب بچے ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں ان کے متعلق جو کوئی بھی کچھ کہہ دے ٹھیک ہی ہوتا ہے۔ بچے کا بغور معائنہ کر کے اس نے ... مسکراہٹ کے ساتھ رتنا کو دیکھا اور پوچھا "رتنا! تم خوش ہو نا؟"

اس سوال میں کتنے ہی سوال تھے۔ وہ کس بات کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔

کہ وہ خوش ہے، شادی ہوجانے کی وجہ سے، بچہ ہونے کی وجہ سے، ماں باپ کے پاس آنے کی وجہ سے یا "ان" کے ساتھ اس کے اچھے تعلقات کی وجہ سے، یا خود اس کی اپنی آمد کی وجہ سے؟

"بہت خوش" رتنا نے آنکھیں میچ کے کہا۔ اس کے اس چھوٹے سے جواب میں کتنے ہی جواب تھے۔ اس جواب نے ونود کو بتایا کہ رتنا کا شوہر اچھا ہے۔ اس کا خیال رکھتا ہے۔ وہ ماں بن گئی ہے اور اب اس کا ایک چھوٹا سا خوب صورت گھر ہے۔ جہاں وہ کچھ دنوں بعد واپس چلی جائے گی۔ ونود کو گویا ایک دھکا سا لگا۔ وہ جیسے اس جواب کی توقع نہیں کر رہا تھا۔ "بہت خوش" اس نے پوچھنا چاہا، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تم کسی اور کے ساتھ کس طرح خوش رہ سکتی ہو؟ تم نے مجھ سے پیار کیا تھا۔ میرے منع کرنے پر بھی۔ میرے لاکھ سمجھانے پر بھی۔ اس دن جب میں اکیلا ڈرائنگ روم میں بیٹھا ریڈیو سن رہا تھا اور تم دوسری طرف سے پردے کے پیچھے سے دہی گا نا گنگنا تی ہوئی آئی تھیں۔ کیا بول تھے اس کے؟ "من کی بات بیان جا ؤ۔" میں نے ہاتھ بڑھا کر کہا "ہلو" جیسے ہمیشہ کہتا تھا جیسے آج بھی کہا ہے اور تم نے میرے بازوؤں میں اپنے آپ کو ڈھیر کر دیا تھا۔ یہ سب صرف چند ہی لمحوں میں اور بالکل انجانے میں ہو گیا تھا۔ کم سے کم میری طرف سے۔ اچانک دوسری طرف سے ٹوکر آ گیا تم نے اپنے آپ کو سنبھال لیا نہ جانے تو کم نے کیا سمجھا ہو۔ لیکن مجھے تو ایسا لگا جیسے تم نے یہ انجانے پن میں نہیں کیا تھا۔ میں تو تمہیں بچی سمجھتا تھا لیکن شاید فلمیں دیکھنے کی وجہ سے۔ یا شاید مجھے معلوم ہی نہ تھا کہ لڑکیاں سب باتیں اتنی جلدی سمجھنا شروع کر دیتی ہیں۔ اس دن تم خوش تھیں اور آج بھی!

"کیا سوچ رہے ہو؟" آنٹی نے گویا لاٹھی سی مار دی "مٹھائی کھاؤ میرا پہلا نواسہ ہے۔ چائے پیو گے؟"

"نہیں آنٹی تھینک یو۔ میں تو بریک فاسٹ کھا کے آیا ہوں۔ ہاں آپ کے بغیر کھانے میں مزا نہیں آیا۔"

"منہ تو میٹھا کرو نا؟" رتنا نے لیٹے لیٹے اپنی کمزور آواز میں اصرار کیا۔ "ہاں سب کچھ کھائے گا۔ ڈپلومیٹ! ابھی چائے بناتی ہوں۔ ہمیں بھی تو کھانا ہے نا؟" آنٹی نے اِدھر اُدھر سے چیزیں اٹھانا شروع کر دیں۔ ایک ہی کمرہ تھا اور وہ پورا گھر بنا ہوا تھا۔ سب کچھ وہیں کرنا پڑتا تھا۔ سٹوو کو میز پر رکھ کر انھوں نے اسے صاف کرنا شروع کر دیا۔

ونود رتنا کے پلنگ کی پائنتی بیٹھ گیا۔

"تمہارے وہ کیسے ہیں؟ کیا نام ہے ان کا۔ میں تو بھول ہی گیا!"

"ہریش۔ بہت اچھے ہیں۔ بہت سیدھے سادے آدمی ہیں۔"

"اور تمہاری ساس — وہ کیسی ہے؟ اچھی مرمت کرتی ہوگی!"

"نہیں تو۔ بہت اچھی ہیں ماتا جی۔ بالکل ممی کی طرح۔ مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔"

"اور" ونود نے تھوڑی دیر کے لیے سوچا "اور گھر بار کیسا ہے؟"

"بہت خوبصورت ہے۔ دو نوکر ہیں۔ بڑا آرام ہے۔" ونود نے رتنا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔ وہی آنکھیں جن کے متعلق رتنا نے ایک بار کہا تھا "آپ کی یہ آنکھیں بڑی بڑی جوگنوں کا تپ بھسم کر دیں گی۔"

"تم ہر طرح سے سکھی ہو رتنا؟"

رتنا مسکرائی۔ اور نظریں جھکا کر اپنے بچے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ اس وقت وہ اتھاہ ممتا کی تصویر نظر آ رہی تھی۔ تصویر بولی "ہاں بھیا اب میں سکھی ہوں ہر طرح سے۔ مجھے سب کچھ مل گیا ہے" اور پھر لہجہ بدلتے ہوئے کہنے لگی "آپ کبھی ہمارے گھر آئیے نا؟ میں نے آپ کے متعلق انھیں بہت کچھ

بتایا ہے وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"کیا کچھ بتایا ہے بھئی؟" اس نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا اور پھر دل میں سوچنے لگا۔ بہت کچھ، لیکن سب کچھ نہیں۔ وہ بھی بتایا ہے؟ جس دن میں بیمار تھا۔ اکیلا ہی بخار میں اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ سنتیش اپنے کمرے میں پڑھ رہا تھا اور میرے علاوہ گھر میں صرف تمہیں تھیں۔ باقی سب لوگ شاید کہیں پارٹی میں گئے ہوئے تھے۔

"چائے پروفیسر صاحب!" آنٹی نے چائے کا پیالا بالکل اس کی ناک کے پاس لاتے ہوئے اور "صاحب" کو لمبا کھینچتے ہوئے کہا۔ پانچ سال پہلے بھی جب وہ کسی سوچ میں ڈوبا ہوتا تو اسے "جگانے" کے لیے آنٹی ایسا ہی کہا کرتیں۔ "پروفیسر صاحب" اس کی پرانی چڑ تھی۔

پیالا ہاتھ میں لیتے ہوئے اس نے اداس سی مسکراہٹ کے ساتھ آنٹی کو دیکھا۔ تو آنٹی کو وہ دن یاد ہیں، مجھے بھی سب یاد ہے وہ کہنا چاہتا تھا۔ اس زندگی کے دن بھی کتنے سنہرے تھے۔ زندگی میں سکون تھا طمانیت تھی۔ اداسی کا کہیں نام ونشان نہ تھا۔ پھر بجائے کچھ کہنے کے اس نے چائے کا ایک گھونٹ لیا۔ چائے کے ساتھ ہی اُسے کمرے میں دواؤں کی جانی پہچانی خوشبو محسوس ہوئی۔ رتنا کے بستر کے سرہانے میز پر کئی دواؤں کی شیشیاں اور ڈبیاں پڑی ہوئی تھیں۔ گرائپ واٹر کی شیشی، ٹنکچر آیوڈین اور پھر کئی ایک ٹانک اس نے سب کے نام پڑھنا شروع کر دیئے۔ وٹامن بی کمپلکس واٹر بری کمپاؤنڈ، کورامن انجکشن (اس کی ضرورت کس کو پڑتی تھی کس کا دل کمزور ہو گیا تھا۔ آنٹی کا؟) وسنف گوناڈین کی گولیاں، یہاں آکر اس کی نظر رک گئی۔ اس کے لیے بھی تو یہ گولیاں لائی گئی تھیں۔ اس دن جب وہ بیمار تھا اور اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا۔ سب لوگ باہر گئے ہوئے تھے سوائے رتنا کے۔ اس نے بستر کے سرہانے

بھی ایسے ہی میز رکھا ہوا تھا اور میز پر پانی کا ڈھکا ہوا گلاس اور یہ گولیاں۔ ہلکا سا بخار۔

اچانک دروازہ کھلا اور دروازے کی چوکھٹ میں کھڑی رتنا بالکل ایک تصویر سی دکھائی دینے لگی "میں اندر آسکتی ہوں"۔ رتنا نے وہیں کھڑے کھڑے سہمی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ضرور ضرور" ونود نے آدھا اٹھتے ہوئے کہا۔ رتنا آکر اس کے بستر کی پائینتی بیٹھ گئی "آپ کی طبیعت کیسی ہے؟" رتنا نے بڑی اداسی سے پوچھا۔

"اچھی ہے۔ دیکھو تو۔ بخار تو اتر رہا ہے" رتنا نے اس کی بڑھائی ہوئی کلائی پر انگلیاں رکھ دیں جیسے نبض کی رفتار گن رہی ہو۔ پھر سے دیکھتی ہوئی بولی "آپ بیمار کیوں ہوتے ہیں۔ جب بھی آپ کو کچھ ہوتا ہے میرا کلیجہ بیٹھ جاتا ہے"

ونود جواب میں صرف مسکرا دیا۔

"اور آپ ہیں کہ آپ کو پرواہی نہیں۔ نہ اپنی اور نہ کسی اور کی"

رتنا نے جواب کا انتظار کیا اور پھر بولی "ٹھیک ہو جائیے نا" ونود نے رتنا کی طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے "پگلی لڑکی" اس نے رتنا کو اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ اور رتنا نے اپنے آپ کو ونود کے بازوؤں میں گر جانے دیا۔ اور اپنا سر اس کے کندھوں پر ڈال دیا۔ وقت رک گیا۔ ماضی، حال، مستقبل سب ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے۔ ہر طرف سکون تھا، سناٹا تھا، زمین نے اپنی گردش بند کر دی تھی ان چند گھڑیوں میں انسانی خوشیوں کی کئی صدیاں منجمد ہو کر رہ گئی تھیں دفعتاً رتنا کو اپنی گردن کی پیٹھ پر گرم سانس کے چھونے سے محسوس ہوا کہ ونود کا بخار ابھی کافی تیز ہے پھر ونود نے رتنا کو جھنجوڑتے ہوئے کہا "اچھا دیکھو! — کوئی آجائے گا" اور آہستہ سے اس سے علیحدہ ہو گیا۔

"آپ بہت ڈرپوک ہیں" رتنا نے ٹھوکر لگائی اور اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

بات یہیں تک رہی۔ وہ آگے بڑھنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ بچیاں تو سینما دیکھ کر نہ جانے کیوں ایکٹنگ کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ اسے تو اس بات کا ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیے۔

اور پھر کچھ دنوں کے بعد نقشہ بدل گیا۔ اسے کام کے سلسلے میں دُور جانا پڑا۔ اور پھر رتنا کی شادی ہو گئی، اور وہ اس شادی میں نہ آ سکا۔ اب رتنا کے لڑکا ہوا ہے۔ اس دن وہ لیٹا ہوا تھا اور رتنا اس کے پائینتی بیٹھی ہوئی تھی۔ اور آج وہ لیٹی ہوئی تھی اور ونود اس کے پائینتی بیٹھا ہوا تھا۔ چکر پورا ہو گیا۔ رتنا کے پہلو میں اس کا دو دن کا بچہ تھا، اور وہ خوش تھی۔ ہاں ہاں دو بار ونود نے پوچھا تھا اور دونوں ہی بار رتنا نے یہی جواب دیا تھا "میں بہت خوش ہوں۔" وہ خوش کیسے ہو سکتی تھی؟ وہ پوچھنا چاہتا تھا اسے تو غمگین ہونا چاہیے تھا۔ اس کے انتظار میں، اس کی یاد میں، اس کے ہجر میں۔ رتنا کو مسکرانے کے بجائے آہیں بھرتا ہونا چاہیے تھا۔ رتنا نے اسے چاہا تھا۔ اتنی جلدی وہ اپنا پیار کیسے بھول سکتی تھی؟ کیا اس نے ماضی کے سب دروازے بند کر دیے تھے؟ اس ماضی کے جہاں وہ اب بھی کھڑا تھا، اس کمرے میں، پلنگ پہ، وہ میز اور سلفا گوناڈین کی گولیاں، اور یہ سب گولیاں۔

ہلکا سا بخار اب بھی تھا اسے لیکن اب رتنا کا کلیجہ نہیں بیٹھا تھا۔ وہ خوش تھی۔ اس نے خود کہا تھا وہ خوش تھی۔ وہ جھوٹ تو نہیں بول رہی تھی۔ پانچ سال میں دنیا آگے نکل گئی تھی۔ رتنا بھی آگے نکل گئی تھی۔ لیکن وہ وہیں کھڑا ہر ایک چیز کو وہیں سے دیکھ رہا تھا۔ کبھی وہ ایک محور تھا دنیا اس کے گرد گھومتی تھی۔ ان پانچ سالوں میں دنیا نے جیسے اپنی عادت بدل دی ہو۔ گھومنے کے بجائے وہ آگے نکل گئی تھی اور وہ وہیں رہ گیا تھا اکیلا، اداس، تنہا، بے چارہ محور۔ آنٹی بھی محور کو چھوڑ کر باتھ روم میں نہانے کے لیے چلی گئی تھیں۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا جہاں لوگ تیز قدمی سے چل رہے

تھے۔ تاکہ دنیا کے ساتھ ساتھ قدم ملا سکیں۔ رتنا اس کی ہر سکتی تھی۔ یہ سچ اس کا ہو سکتا تھا۔ رتنا ہریش کے بجائے اس کے بارے میں لوگوں سے باتیں کرتی ہوتی اگر وہ رک جاتا لیکن ـــ "سچ بتاؤ رتنا! تم واقعی خوش ہو؟"

"تمہیں کیا ہو گیا ہے بھیا کہا تو ہے نا میں نے ـــ میں بہت خوش ہوں مجھے سب کچھ مل گیا ہے اور کیا چاہیے تھا مجھے؟" وِنو مسکرا پڑا اُس نے بچے کا ماتھا چوما رتنا کے سر پہ بڑے بھائی کی طرح شفقت سے ہاتھ پھیرا اور اٹھ کر آہستہ سے باہر نکل گیا باہر نکل کر اس نے کمرے کا کواڑ آہستہ سے بند کر دیا۔ آہستہ سے لیکن مضبوطی سے، ہمیشہ کے لیے۔

وی آئی پی

انگریزی زبان نے ہمیں بے شمار الفاظ اور اصطلاحیں دی ہیں۔ جو آج زبان زدِ عام و خاص ہیں۔ کئی اصطلاحیں ایسی بھی ہیں جن کا ترجمہ ناممکن ہے اور وہ جوں کی توں ہی ہماری زبان میں چلی آئی ہیں۔ اسی قسم کی ایک بیش قیمت اصطلاح ہے "وی، آئی، پی"

وی آئی پی کا مطلب ہے: VERY IMPORTANT PERSON یعنی بہت اہم شخصیت۔ اس کے معنی "بڑے آدمی" کے بھی لیے جا سکتے ہیں لیکن ایک عام بڑے آدمی اور اس بڑے آدمی میں فرق یہ ہے کہ عام آدمی تو روپیوں سے بھی "بڑا" ہو سکتا ہے لیکن "وی، آئی، پی" وہ بڑا آدمی ہوتا ہے جس کی اہمیت کو حکومت تسلیم کرتی ہے اور اس کے لیے خاص اہتمام کرتی ہے۔ ہندوستان کا صدر، وزیر اعظم، وزرا وغیرہ تو اصلی وی، آئی، پی ہوتے ہیں۔ ان سے نیچے کی سطحوں پر ہر ریاست میں، ہر ضلع میں، ہر شہر میں حتیٰ کہ ہر محلے میں بھی وی آئی پی پائے جاتے ہیں۔ اعلیٰ سرکاری

افسر بھی اسی زمرے میں شامل کر لیے جاتے ہیں۔ ایک آسان فارمولا یہ ہے کہ وہ تمام لوگ جو ہوائی اڈے پر صدر ہند یا وزیر اعظم کو الوداع کہنے جاتے ہیں اور بہ اعتبار عہدہ جن کے نام اگلے دن اخباروں میں چھپتے ہیں، کم و بیش وی، آئی، پی کہے جا سکتے ہیں۔

وی آئی پی اور وی پی پی میں صرف ایک بات مشترک ہوتی ہے۔ دونوں کو "ریسیو" کرنے میں کچھ خرچ ہوتا ہے۔ لیکن جہاں وی پی پی کا خرچ ایک فرد برداشت کرتا ہے وہاں وی آئی پی کا خرچ پوری قوم کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

وی آئی پی کے بعد ایک اور زمرہ آئی پی کا بھی ہوتا ہے جس کے معنی "اہم شخص" کے ہوتے ہیں۔ ایسے "اہم شخص" حقیقی اور خود ساختہ گلی گلی میں ملتے ہیں۔ ہر پیشے میں، ہر شعبے میں، ہر ایک کام میں، ہر زمرے کے اپنے اپنے اہم شخص ہوتے ہیں رکشا والوں کے لیے ٹریفک کا سپاہی اہم شخص ہوتا ہے۔ سیندھی بیچنے والوں کے لیے ایکسائز انسپکٹر اہم شخص ہوتا ہے۔ گتہ داروں کے لیے پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے انجینیر، منافع خوروں کے لیے انکم ٹیکس افسر اور راقم الحروف جیسے تنخواہ یاب لوگوں کے لیے اکاونٹنٹ جنرل کے آفس کا محاسب اہم شخص ہوتا ہے جو بلا وجہ تنخواہ میں کٹوتی کر لیتا ہے۔ ایسے اہم اشخاص کی تو کوئی انتہا نہیں لیکن حقیقی اہم شخص وہ ہوتا ہے جس کی اہمیت صرف لوکل ہی نہ ہو بلکہ اس کا اعتراف اس کے دائرۂ اختیار سے باہر بھی کیا جاتا ہو۔ میرا خیال ہے کہ اس زمرے میں وزرا کو چھوڑ کر کچھ اعلیٰ افسران شامل کئے جا سکتے ہیں۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں نے وی آئی پی دیکھے ہوں گے، ان کے ساتھ واسطہ پڑا ہوگا اور مقامی وی آئی پیوں کے ساتھ تو راست تعلقات بھی ہوں گے پھر بھی اردو ادب میں اس طبقے پر مضامین کی گرانی ہے۔ ایک آئی پی کے عادات و اطوار آداب و سلیقہ، انداز گفتگو اور عام رویّہ، یہ سب ایسے موضوع ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنے والوں نے (حسد کی وجہ سے؟) اہم

شخص کی جائز اہمیت کا اعتراف نہیں کیا۔ ایک مضمون میں ان سب موضوعات پر سیر حاصل بحث کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے اس مضمون میں کچھ پہلوؤں پر ہی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جارہی ہے میرے اس مضمون کو دیکھ کر شاید کچھ دوسرے ادیب و دست اپنا قلم اس موضوع پر آزمانے کی کوشش کریں۔ میرا خیال ہے کہ میرے لیے ایک اہم شخص کی یہی خدمت کافی ہوگی کہ میں اسے قعر گمنامی سے نکال کر ادب کی شاہراہ پر کھڑا کر دوں۔ اگر قارئین میں بھی کوئی آئی پی ہو تو وہ اس شیشے میں اپنا منہ دیکھ کر صاف کر سکتا ہے۔

'اہم شخص' کی شام اس کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم حصہ ہوتی ہے صبح تو وہ سو کر ہی گزار دیتا ہے۔ رات کو اتنی دیر ہو جاتی ہے کہ صبح بہ مشکل تمام، کام کے وقت تک اٹھا جاتا ہے۔ آفس میں وہی روٹین کام، وہی اونگھنا اور اونگھتے ہوئے کلرکوں پر بھونکنا، اور بوڑھی بوسیدہ فائلوں پر مکھی بھگانا۔ آفس کی حاضری میں باقاعدگی چھوٹے لوگوں کا کام ہے۔ اہم شخص دیر سے آتا ہے اور پہلے چلا جاتا ہے۔ اس خاصیت کو اہم شخص کے ساتھ ایسی تاریخی اور روایتی وابستگی حاصل ہوگئی ہے کہ اگر کوئی 'اہم شخص' آفس پابندی سے آئے اور پابندی سے جائے تو اس کے اپنے محکمے کی تو کیا سارے شہر کی بھویں اس پر تن جاتی ہیں۔ لوگ اس کے شجرۂ نسب کو ڈھونڈ کر یہ ثابت کرنے کی فکر میں پڑتے ہیں کہ یہ ضرور کوئی نقلی چیز ہے پھر آہستہ آہستہ وہ 'اہم شخص' لوگوں کی توقع کے خلاف حقیقتاً ایک اہم شخص ثابت ہونے لگتا ہے۔ ہم سب کتنے مجبور ہیں؟ اپنی عادتوں کے غلام، اہم شخص صرف ایک ہی طرح کی چال چل سکتا ہے۔ اگر وہ کوئی دوسری چال چلے تو اس کی اہمیت پر شک ہونے لگتا ہے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے اہم شخص کی شام اس کی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہوتی ہیں۔ اہم شخص کو ہفتہ میں کم از کم چار پانچ شامیں باہر گزارنا چاہئیں اور باقی شاموں میں دوسرے لوگوں کو اس کے گھر آنا چاہیے۔ کوئی جتنا زیادہ اہم شخص ہوگا، اتنی ہی

اس کی شا میں باہر گزریں گی۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ دنیا کو بتا سکے کہ وہ کسی اہم شخص کو شخصی طور پر جانتا ہے۔ اس لیے ہر قسم کے لوگ اسے دعوتوں پہ بلاتے ہیں۔ جو خود خرچ کر سکتے ہیں وہ اپنے پلّے بلاتے ہیں۔ جو ایسا نہیں کر سکتے وہ دوسروں کے سر پہ سوار ہو کر کلبوں میں، سوسائٹیوں میں، مجلسوں میں کئی بہانوں سے اس کا قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ میں نے اہم شخصیتوں کا پارٹیوں میں گہرا مطالعہ کیا ہے۔ ان کے آنے سے لے کر پارٹی کے اختتام تک ان کے طور اطوار، اٹھنے اور بات چیت کا سلیقہ اور دوسرے لوگوں کا ان کی جانب رویہ، ان سب کو میں نے بہت اچھی طرح دیکھا ہے۔

اچھا چلیئے اب ہم آپ کو ایک اہم شخص کے ساتھ ایک کاک ٹیل پارٹی میں لے چلتے ہیں۔ عام طور پہ کاک ٹیل کا وقت ۷ بجے سے ۹ بجے تک ہوتا ہے۔ اس دوران میں آپ کبھی بھی آ سکتے ہیں۔ لیکن ہر حال میں آپ کو 9 بجے سے پہلے چلا جانا چاہیے۔ کچھ مفت خورے قسم کے لوگ کاک ٹیل کا نام سنتے ہی وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ عام لوگ مقررہ وقت پہ یا پانچ دس منٹ کے بعد پہنچتے ہیں۔ لیکن اہم شخص؟ اہم شخص ایسے ویسے ہی نہیں پہنچ جاتا۔ وہ جانتا ہے کہ پہلے آدھ گھنٹے تک لوگ آتے رہتے ہیں اور پینتالیس منٹ تک تقریباً ایسے سبھی لوگ جن کو آنا ہو پہنچ جاتے ہیں۔ اگر آپ اس وقفے میں آئیں تو آپ کئی اور لوگوں کے ساتھ وارد ہوں گے اور ضروری ہے کہ میزبان آپ کے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی خوش آمدید کہے گا۔ کسی بھی گروہ کے ساتھ آنے سے انسان کی شخصی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔ وہ گروہ کا ایک فرد بن کر رہ جاتا ہے اس لیے اہم شخص کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ ذرا دیر سے آئے لیکن کتنی دیر سے؟ اہم شخص کو یہ معلوم ہے کہ ساڑھے آٹھ بجے کے بعد لوگ جانا شروع کر دیتے ہیں اور ایسے وقت میں آپ کا آنا ذرا نامناسب سا معلوم ہو گا۔ تقریباً پونے آٹھ بجے سے ساڑھے آٹھ بجے تک پارٹی اپنے جوبن پہ ہوتی ہے اور اگر اس وقت

کوئی آئے تو تمام لوگوں کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہوں گی پس اہم شخص پونے آٹھ کے قریب آئے گا اور تقریباً ساڑھے آٹھ کے قریب چلا جائے گا سب لوگ اسے آتے ہوئے بھی دیکھیں گے اور جاتے ہوئے بھی۔

یہ بات بھی قابلِ مطالعہ ہے کہ اہم شخص کمرے میں کیسے وارد ہوتا ہے۔ کاک ٹیل اور ایسی پارٹیوں میں لوگ جوں جوں آتے ہیں، گروپوں میں بٹتے جاتے ہیں۔ لیکن ایک خاص بات آپ نے دیکھی ہو گی کہ جو کوئی بھی آتا ہے وہ داہنی طرف دیوار کے جتنا پاس ہو سکے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح وہ لوگوں کی نظروں سے بچ سکتا ہے اور نفسیاتی طور پر اسے اس دیوار کا ایک قسم کا سہارا سا ملتا ہے۔ اس لیے عام طور پر زیادہ تر پارٹی کے لوگ دیواروں کے پاس کھڑے ہوتے باتیں کرتے ہوتے ہیں۔ بڑا آدمی آتا ہے تو وہ داہنی طرف نہیں مڑتا بلکہ سیدھا مرکز کی طرف رُخ کرتا ہے اور جوں ہی وہ وہاں پہنچتا ہے کچھ ستارے وہیں جمع ہو جاتے ہیں اور پھر اہم شخص کا وہاں اپنا "دربار" لگ جاتا ہے۔ ایک انگریز پروفیسر نے اس موضوع پر تحقیق کی ہے اور اس نے یہاں تک حساب لگایا ہے کہ اگر کمرے کو برابر کے مربعوں میں تقسیم کیا جائے اور ہر ایک مربع کو کوئی نام دیا جائے تو اہم شخص ایک مخصوص وقت ایک مخصوص مربع میں ہو گا۔

ایسی پارٹیوں میں اہم شخص کسی بھی شخص کی طرف مسکرا کر دیکھ لے تو وہ آدمی فوری آداب بجا لاتا ہے اور ایسی کھسیانی صورت بنا لیتا ہے گویا وہ اہم شخص اس کا کوئی قرض خواہ ہو جس کی طرف اس کی ذرا نظر جاتی ہے، وہی اس سے بات کرنے کا مشتاق دکھائی دیتا ہے۔ اہم شخص اچانک کسی سے بات شروع کرتا ہے اور وہ آدمی پورے اشتیاق سے اس موضوع پر توجہ دینے لگتا ہے تو اہم شخص فوراً اس بات کو بیچ میں ہی چھوڑ کر اور EXCUSE ME کہہ کر کسی دوسری طرف چل پڑتا ہے۔ ایسی پارٹیوں کا ایک

قاعدہ ہے کہ کبھی کسی موضوع پر سنجیدگی سے، سیر حاصل بحث کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ یہ یونیورسٹی کا قہوہ خانہ نہیں جہاں موضوع کے بال کی کھال اتاری جاتی ہے۔ یہاں بس ہاتھ لگاؤ، چھوڑو اور آگے بڑھو کی پالیسی پہ عمل ہونا چاہیے۔ ابھی چند دن ہوئے مجھے ایسی ایک پارٹی میں جانا پڑا۔ جہاں ایک غیر ملکی اہم شخص آیا ہوا تھا۔ وہ مہمانوں میں سے بہت کم کو جانتا تھا۔ اس لیے اس نے میرے ساتھ بات چیت شروع کر دی۔ میرے بند گلے کے کوٹ کو دیکھ کر بولا — "بہت خوب صورت ہے۔ آپ ہندوستانی لوگ بہت اچھے کپڑے پہنتے ہیں۔ یہ بھلا کون سا کپڑا ہوگا؟"

میں نے اس کا اشتیاق دیکھ کر جواب دیا — "جی نہیں . . ."

اور قبل اس کے کہ میں جملہ ختم کر سکتا وہ EXCUSE ME کہہ کر جا چکا تھا۔ اس نے دور سے ایک وی آئی پی کو آتے دیکھا تھا اور اسی لمحے اس کا اشتیاق، جسے کہ میں حقیقی سمجھ بیٹھا تھا، ختم ہو گیا تھا۔ پارٹی کے ختم ہونے کے وقت ہم پھر ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ وہ اب شاید پھر اسی موضوع کو دہرائے لیکن اس نے اس کا ذکر تک نہیں کیا۔ ایسی پارٹیوں میں صرف "ٹوٹی ہوئی" گفتگو ہو سکتی ہے۔ جو شخص اس راز کو جانتا ہے وہ کامیاب ہوتا ہے۔ ایسا شخص ان پارٹیوں میں چمکتا ہے۔ جو اس راز کو نہیں جانتا وہ "بور" کہلاتا ہے اور لوگ اس سے دور بھاگتے ہیں۔

پوشاک کے بارے میں بھی اہم شخص دوسرے لوگوں سے کچھ مختلف ہوتا ہے۔ عام شخص موقع کے مطابق پوشاک پہننے کی حتی الوسع کوشش کر کے بھی وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکتا لیکن "اہم شخص" ذرا مختلف پوشاک پہن کر اپنی جداگانہ شخصیت کو اور بھی نمایاں کر دیتا ہے اگر بند گلے کا کالا کوٹ پہننے کا موقع ہے تو "اہم شخص" صرف سوٹ

میں ہی آجائے گا۔ اگر سوٹ پہننا لازمی ہے تو اہم شخص شرٹ میں باز و لٹکاتا چلا آئے گا اور آتے ہی پوشاک کے بارے میں ایسا چٹکلا چھوڑے گا کہ سوٹوں میں ملبوس باقی سب لوگ اپنے آپ کو ننگا محسوس کرنے لگیں گے۔

اہم شخص کو اکثر لوگ پہچانتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اُسے نہ پہچانے ایسے موقعوں کے لیے اس کے ساتھ اکثر ایک دو مصاحب یا "چمچے" رہتے ہیں جو اہم شخص کی تعریف میں ضرورت پڑنے پر صرف اتنا ہی کہتے ہیں:

"ارے پہچانتے نہیں صاحب کو؟" یا پھر ــــ

"کچھ سوچ سمجھ کر بات کرو۔ جانتے ہو کس سے مخاطب ہو؟"

حریف بس اسی بات پر مرجاتا ہے اور اہم شخص کا راستہ صاف ہو جاتا ہے۔

حقیقی اہم شخص تو واقعی مصروف آدمی ہوتا ہے۔ لیکن کئی خود ساختہ قسم کے اہم شخص اہم دکھائی دینے کے لیے بہت سے حیلے کرتے ہیں۔ کوئی ملنے آئے تو پہلے سے ہی کچھ لوگوں کو فون کرنے کے لیے کہہ رکھتے ہیں۔ جب ملاقاتی دیکھتا ہے کہ اس تھوڑے سے عرصے میں اتنے فون آئے ہیں تو وہ متأثر و مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا لیکن ڈھول کا پول کبھی نہ کبھی کھل ہی جاتا ہے۔

ایک اور طریقہ جو کچھ اہم شخص استعمال کرتے ہیں یہ ہے کہ اگر کوئی ملاقات کے لیے آئے تو وہ اس کے آنے سے پہلے ہی کھڑے ہو کر فائلیں دیکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اہم شخص کو کھڑا دیکھ کر ملاقاتی بھی بیٹھ نہیں سکتا۔ اور اگر اہم شخص کے اصرار کرنے پر بیٹھ بھی جائے تو اسے یہی خیال رہتا ہے کہ کہیں میں زیادہ وقت تو نہیں لے رہا۔ نفسیات کی ایک کتاب میں جس میں اہم شخصیتوں کو کچھ گر بتائے گئے ہیں۔ یہ بھی مشورہ دیا گیا ہے کہ ملاقاتی کے کمرے میں داخل ہونے سے پہلے ہی کھڑے ہو جاؤ۔ اگر وہ ایسا آدمی ہے جس سے آپ ملاقات کرنا نہیں چاہتے تو اس کے آتے ہی کہیئے ــ "معاف کیجیئے گا۔ میں ابھی

باہر جا ہی رہا تھا خیر بتائیے میں آپ کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟" اگر ملاقاتی اپنی پسند کا آدمی ہو تو آپ اشتیاق سے ہاتھ بڑھائیے: "اچھا ہوا میں ابھی آ ہی رہا ہوں۔ آئیے تشریف رکھیئے اور اطمینان سے بات کیجیئے۔" میں نے دیکھا ہے کہ یہ طریقہ کافی کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

اہم شخص سماج کے ہر شعبے میں مل سکتا ہے لیکن اکثر وہ اعلیٰ سرکاری عہدوں پر ملتا ہے۔ اسے اپنے کام پر تو پورا عبور حاصل ہوتا ہی ہے لیکن دوسرے موضوعات پر بھی بات چیت کرنے کی اس میں صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ سماج میں ایک بہت ضروری رول ادا کرتا ہے اور کچھ اہم اشخاص تو سماج کی چھوٹی اور تنگ حدوں کو پار کرکے تاریخ کے نئے گنے لوگوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔ آج کا ایسا 'حقیقی' اہم شخص" کل کی تاریخ کا معمار بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے آئیے! آج (٭) کے تاریخی دن ہم بھی اسے خراجِ عقیدت پیش کریں اور انگریزی کی اس اصطلاح "وی آئی پی" کو اردو زبان کے دامن میں سمیٹ لیں۔

٭ (یہ مضمون ۱۵ اگست کو شائع ہوا تھا)

پانچواں کاف

جیسے سکھوں کے مذہب میں پانچ کاف لازم ہیں (کیس، کنگھی، کڑا، کرپان اور کچھا) اور ہر اچھے سکھ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان پانچوں کافوں کا استعمال کرے ویسے ہی ہماری سوشل زندگی میں "صاحبی" کے بھی پانچ کاف ہوتے ہیں اور ہر شخص کو جو اپنے آپ کو صاحب کہلانا چاہتا ہو، یہ لازم ہے کہ وہ ان پانچ کافوں کو جلد از جلد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ صاحبی کے پانچ کاف بالترتیب یہ ہیں:

کوٹھی، کار، کلب، کنڈرگارٹن، کتا۔

یعنی اگر آپ صاحب ہیں تو آپ کو کوٹھی میں رہنا چاہیے۔ آپ کے پاس سواری کے لیے نہیں تو کم از کم نمائش کے لیے کار ہونی چاہیے۔ آپ کو کسی نہ کسی کلب کا ممبر ہونا چاہیے۔ آپ کے بچے کو پانچ سال کی عمر سے پرائمری اسکولوں میں مفت تعلیم حاصل کرنے کی بجائے دو سال کی عمر سے ہی بالاخرچ کنڈرگارٹن میں کھیلنے کے لیے جانا چاہیے اور پھر

آپ کے پاس ایک کتا بھی ہونا چاہیے (جو آپ کو بھونکنا سکھا سکے) یہ پانچ کاف صاحبی کے لیے ضروری ہیں اور ان کے بغیر کوئی بھی شخص پورا صاحب نہیں بن سکتا۔ ہاں یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ اپنے بارہ روپے ماہانہ پانے والے نوکر سے بے شک اپنے آپ کو صاحب کہلوا لیں لیکن ان کافوں کی عدم موجودگی میں خلقِ خدا تو آپ کو "بابو" ہی پکارے گی۔

ان پانچ کافوں کے علاوہ دو اور کاف بھی ہیں مثلاً "کال" اور "کاک ٹیل" کال کا مطلب ایک دوسرے سے ملنے کے آداب اور کاک ٹیل کے معنی پارٹیوں میں مختلف قسم کی پینے کی اشیاء کا استعمال۔ یہ کاف صاحب بہادری" کے لیے ہوتے ہیں صرف صاحبی کے لیے مندرجہ بالا پانچ کاف ہی کافی ہیں۔

ہر قسم کے لوگ صاحب بن سکتے ہیں۔ نوکری پیشہ، تاجر اور ٹھیکے دار وغیرہ۔ لیکن جہاں نوکری پیشہ لوگوں کی صاحبی عہدے پر مبنی ہوتی ہے، وہاں بزنس والوں کی صاحبی پیسے پر مبنی ہوتی ہے۔ نوکری پیشہ صاحب عام طور پر غریب ہوتے ہیں لیکن بزنس مین کو صاحب بننے سے پیشتر بہت "کھڑوس" ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح نوکری میں جہاں لوگ آہستہ آہستہ گھستے گھستے صاحبی تک پہنچ جاتے ہیں، وہاں بزنس والوں کو اس کے لیے کافی محنت سے کام کرنا پڑتا ہے۔ بہرحال ایک مخصوص (LEVEL) معیار تک پہنچنے کے بعد سب لوگ صاحب بن سکتے ہیں اور اس وقت یہ پانچ "کافیہ" علامتیں موجود ہوتی ہیں۔ اگر ان کے متعلق آپ بھول گئے تو پھر چاہے آپ کے پاس کچھ بھی ہو آپ صاحب نہیں کہلائیں گے۔

جب ہم صاحب بنے تو ہم نے اپنی جائداد کا جائزہ لیا کہ دیکھیں ہم "صاحبی" کے لوازمات پورے کرتے ہیں یا نہیں؟ کوٹھی تو ہمیں حکومت کی طرف سے مل ہی گئی تھی۔ ویسے بھی کوٹھی کے معاملے میں بڑی دلچسپ بات ہے کہ افسر اگر معمولی مکان میں بھی رہتا ہو تو

وہ کوٹھی یا بنگلہ کہلاتا ہے، اور دوسرے لوگ اگر کوٹھی میں بھی رہتے ہوں تو وہ مکان ہی کہلاتا ہے۔ (یہ ہے سرکاری نوکری کا جادو!) جہاں تک کار کا تعلق ہے، ہم نے ادھر ادھر سے قرض لے کر ایک ان ایئر کنڈیشنڈ سیکنڈ ہینڈ کار بھی لے لی تھی (جس کے ہارن کے سوائے باقی سب پرزوں سے آواز آتی تھی)۔ شہر میں ایک سستی سی کلب بھی تھی اور ہم اس کے ممبر بھی بن گئے۔ بہت ہچکچاہٹ کے بعد بچے کو نرسری گارڈن میں بھی داخل کروا ہی دیا۔ (آپ ہی جانیئے تین سال کے بچے کی کھیل کود پر اس سے کہیں زیادہ فیس دینا، جتنی ہم نے ایم اے کی پڑھائی کے لئے دی تھی، اپنے کی کمائی کا خون ہی تو کرنا ہے!)

المختصر یہ کہ چاروں شرطیں تو پوری ہوگئیں اب صرف ایک کاف کی کسر رہ گئی تھی... اور وہ تھا کتا۔

اور اس کاف کی اپنی ہی کہانی ہے۔

ہمارے والدین کے گھر تو کبھی کسی قسم کا پالتو جانور نہیں رکھا گیا تھا۔ ہماری ماں اس کے سخت خلاف تھیں اور اس کے لیے وہ کئی دلیلیں دیتی تھیں جن میں سے ایک ہمیں ابھی تک یاد ہے۔ ان کا کہنا تھا (اور ہے) کہ جو پیسہ کسی جانور کی پرورش اور خوراک پہ ضائع کرتے ہیں، اس سے کسی غریب کی مدد کی جا سکتی ہے۔ (ظاہر ہے جانور ان کی نظر میں غریب نہیں تھے) خیر جتنی دیر ہم اپنے والدین کے پاس رہے، پالتو جانوروں کے لیے ترستے رہے۔ بارہا ہم سب بچے کبھی کسی پلے گراؤنڈ سے کوئی پلّا لاتے، کبھی خرگوش چرا لاتے اور کبھی کسی بوڑھے صاحب کی نوزائیدہ کتیا کے پلّے اٹھا لاتے لیکن باوجود ہزار کوشش کے ایک آدھ دن سے زیادہ کسی کو بھی نہ رکھ پاتے۔ ہم سب بچوں نے مل کر اپنے حصے کا دودھ کا راشن کم کرنے کی پیشکش کی، انھیں علیحدہ رکھنے کا وعدہ کیا لیکن اماں کو ان کے خلاف کچھ ایسی ضد تھی کہ ہماری ایک بھی نہ چلی۔

ایک دن ہم پانچ بچوں پر مشتمل ایک ڈیپوٹیشن اماں کے پاس گیا اور راست سوال

کیا — "کیا آپ کو کتے پالنا پسند نہیں ؟"

"نہیں تو" — اماں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا۔

"تم سب کو جو پال رہی ہوں"

اس جواب سے ہمارے دل ہی تو ٹوٹ گئے۔ اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے۔ اس واقعے کے بعد کبھی ہماری ہمت نہ پڑی کہ اس موضوع پر اماں سے ٹکر لی جائے۔ اس طرح ہمارا بچپن جیسے کئی لحاظ سے لاجواب گزرا۔ ویسے ایک لحاظ سے لاکتا بھی گزرا۔ اور پھر جوانی میں تو آپ جانتے ہیں، نگاہیں کتے سے زیادہ دلچسپ چیزوں کی تلاش میں رہتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں والدین کے گھر ہمیں کتا پالنا نصیب نہ ہوا۔

پھر جب اماں کی بہو آئی تو جہاں آپس میں کئی باتوں میں ان کا نظریہ بالکل مختلف تھا وہاں پالتو جانوروں اور خاص کر کتوں کے متعلق دونوں کا نقطۂ نظر ایک ہی تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح "امن کی بات سمجھی مان جائے" لیکن کتے کے بارے میں تو بہو کچھ ایسی ساس پرست ثابت ہوئی تھی کہ "بس" یا "میں یا کتا"

اب آپ جانتے ہیں کہ عشق میں سگِ لیلیٰ سے پیار کرنا لازم ہے، سگِ مجنوں سے نہیں کیوں کہ مجنوں میں خود سگ کی صفتیں پائی جاتی ہیں اس لیے دوسرے کتے کی شاید ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے ہماری لیلیٰ نہ مانی۔ ہم نے اس مسئلے کے حل کے لیے بہتیرا سر کھپایا۔ اور یہاں تک کہ "ہدایت نامہ خاوند" بھی پڑھ ڈالا لیکن جہاں وہ اور بہت سی دلچسپ چیزوں سے بھرا پڑا تھا وہاں اس معاملے میں ہماری کچھ مدد نہ کر سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنے محبوب کی افراط کے باوجود فراقِ سگ میں سوکھے جا رہے تھے۔

ہم نے بیگم کو لاکھ سمجھانے کی کوشش کی کہ گھر میں خدا کا دیا ہوا سب کچھ ہے

چار کاف موجود ہیں۔ پانچواں کاف بھی حاصل کر لیا جائے تو زندگی بن جائے۔ پورے اصلی انگیارگ صاحب بن جائیں گے۔ صرف ایک کاف کی کمی سے ہماری "صاحبی" میں ایک خامی رہ گئی ہے، تھوڑی سی بات ہے۔ اس کے لیے اتنا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ جدھر جاتے ہیں، چاروں طرف لوگ انگلیاں اٹھاتے ہیں کہ یہی ہے وہ کنجوس صاحب، کتے کے بغیر صاحب، ادھورا صاحب، نامتمام صاحب، اور پھر ہم نے بارہا کتے کے اوصاف پر لیکچر بھی جھاڑے۔ کتنے فائدے ہوتے ہیں کتا پالنے کے۔ چوری کا خطرہ نہیں رہتا۔ گھر کی رکھوالی ہوتی ہے۔ وفاداری کا سبق ملتا ہے۔ شام کو جب سیر کرنے جاؤ تو پیچھے آتا ہوا کتا شان کو دوبالا کرتا ہے بجلی کے ہر کھمبے کی آپ پاسنی کرتا جاتا ہے۔ کتنا اچھا جانور ہے ایک بار پال کر تو دیکھو۔

لیکن بیگم کے کان پر جوں تک نہ رینگی (زیادہ صفائی سے یہی ہوتا ہے۔ کوئی جوں ہوتی تو رینگتی!)

بیگم اس وقت تک اٹل رہیں جب تک ہمارے ڈر لیوک لغرے میں ایک نٹ کھٹ سنگاف چیخ کا اضافہ نہ ہو گیا۔ وہ مانگ بھی ہمارے اکلوتے ہونہار لخت جگر فرزند ارجمند، ماں کی آنکھوں کے تارے اور دنیا سے نیارے کی۔ ہم نے کتے کی مانگ کچھ ایسے انداز سے اس کی زبان پر چڑھا دی تھی کہ ہر بات پر اس کے منہ سے کتا ہی نکلتا۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، ہنستے روتے بس کتے کے نام کا ہی جاپ کیا جاتا۔

کبھی بیگم ذرا تنگ آ کر کہتیں "چلو باہر جا کر کھیلو" تو توتلی زبان سے جواب ملتا۔ "ہم تو کتے سے کھیلیں گے" کبھی بیگم ہمیں سناتے ہوئے اس سے پوچھ بیٹھتیں:

"بچے تمہیں بھائی چاہیے یا بہن؟"

جواب ملتا "کتا"

کبھی بیگم لاڈ میں پوچھ لیتیں "میرے راجے تم کس کے بچے ہو؟"

جھٹ جواب ملتا "کتے کے"

غرض کہ کتا اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا حالانکہ بیگم اس نامعقولیت سے سخت نالاں تھیں پھر ہمیں ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ بیگم کی کتے کی مخالفت میں اب وہ زور نہیں رہا جو پہلے تھا۔

ایک دن جب بچے نے اپنی روزمرہ کی مانگ دہرائی کہ ہمیں کتا چاہیے تو بیگم بولیں جاؤ لے آؤ۔ ہم نے موقع غنیمت سمجھا اور بھاگے کتے کی تلاش میں۔

ہم نے پہلے ہی سے چند دوستوں کو کہہ رکھا تھا کہ کوئی اچھا سا چھوٹا سا، کم خرچ پلا مل جائے تو ہمارا خیال رکھنا۔ شاید بیگم مان جائیں۔ ویسے تو صاحبوں کے لیے مناسب کتا ALSATION ہوتا ہے لیکن اس پر خرچ بڑا ہوتا ہے BOXER اور FOX TERRIER بھی کچھ مہنگے ہی پڑتے ہیں۔ ہمارے گھر کے لیے تو وہ چھوٹے چھوٹے سے جیبی کتے ہی موزوں ہو سکتے تھے، شفیق، شریف اور کم خرچ۔ پھر ایک شرط بیگم کی یہ بھی تھی کہ کتا مفت ملنا چاہیے۔ خریدنا سراسر فضول خرچی ہے۔ اس شرط کو ہم نے اپنے دوستوں میں کافی پبلسٹی دے رکھی تھی اور آخر چندر شیکھر صاحب کے ہاں سے ایک بھورے رنگ کا ڈیش ہنڈ (DASH HUND) پلا مفت ہی مل گیا۔

ہم نے اس کا نام مصر کے شہنشاہوں کے نام پر "فیرو" رکھا تاکہ جیتی دنیا تک اس کا نام قائم رہے۔ پلا ہونہار تھا اور کچھ ہی دنوں میں پل کر اچھا خاصا کتا بن گیا۔ اب بیگم نے مان تو لی تھی کتا رکھنے کی بات لیکن وہ اسے ایک آنکھ نہ دیکھ سکتیں۔ سب کی آنکھوں کا تارا فیرو، بیگم کی آنکھوں میں کھٹکتا تھا۔ کبھی پیار سے ٹانگوں سے لپٹتا تو دفعان ہونے کو کہتیں۔ اس کی کوئی بات بھی انھیں نہیں بھاتی تھی۔

بھونکتا تو کہتیں کہ کم بخت سونے بھی نہیں دیتا۔ چپ رہتا تو کہتیں نگوڑا نمک حرام ہے گھر کا خیال بھی نہیں رکھتا حتیٰ کہ دُم پر اعتراض اٹھاتیں کہ ٹیڑھی ہے اور ہلتی ہے۔ ان کے پاس اس کے پیار محبت اور شفقت کا صرف ایک ہی جواب تھا: "گیٹ آؤٹ سکاؤنڈرل" اور وہ بے چارہ اسی کو غنیمت سمجھ کر اپنی دُم ہلا دیتا۔

غرضیکہ بیگم اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتیں گویا فیرو ہماری پہلی بیوی کی اولاد ہو۔ ادھر جتنی بیگم اس کے ساتھ سخت ہوئیں اتنا ہی ہم اور صاحبزادے اس کے دلدادہ تھے۔ کھانا کھاتے وقت ساتھ، سیر کرتے وقت ساتھ (اسی کے لیے تو فیرو لیا تھا) آرام کرتے وقت ساتھ لیکن جتنا ہم اسے چاہتے تھے اتنا ہی بیگم اس سے چڑتی تھیں اور ان دونوں کے تعلقات ایسے تھے جیسے بیگم بیگم نہ ہوں، اینٹ ہوں۔ المختصر ہمارے تمام پیار کے باوجود ہمارے گھر میں فیرو کی زندگی واقعی کتے کی زندگی تھی اور بارہا ہمیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ فیرو اپنی زندگی میں کوئی خلا کوئی کمی محسوس کر رہا تھا۔ نہ جانے یہ اس کے ساتھ بیگم کے سلوک کا نتیجہ تھا یا اس پر جوانی کی آمد کی علامت تھی لیکن ہم نے اسے بارہا شام کے وقت بائرن کی نظم کا مجسمہ بنے ہوئے "چہرہ پریشان بھیگی پلکیں" لیے ہوئے رنجیدہ دیکھا۔

آہستہ آہستہ فیرو ہمارے گھر کا ایک فرد بن گیا۔ یہاں تک کہ بیگم بھی اس کی کچھ کچھ مرید ہو گئیں۔

لیکن انسانی خوشی مکمل کیسے ہو سکتی ہے۔ اِدھر ہماری صاحبی پُرامن طور پر مکمل ہو رہی تھی۔ اُدھر آسمان کے فرشتوں نے سازش کی اور ایک دن آناً فاناً اس آشیانے پر بجلی گری۔

بات دراصل یوں ہوئی کہ اسکول میں ہمارے بچے کی کلاس ٹیچر نے یہ بتایا کہ کتے کی دم اگر بارہ برس بھی پانی میں رکھی جائے تو سیدھی نہیں ہو سکتی۔ اب

ہمارا بچہ جب تک کسی بات کا ذاتی تجربہ نہ کر لے اسے مانتا ہی نہیں۔ اس دن جب وہ گھر آیا تو پڑوسیوں کے بچوں کو اکٹھا کر کے یہ فیصلہ ہوا کہ فیرو کی دم کاٹ کر اسے کچھ عرصے کے لیے پانی میں رکھ کر دیکھا جائے کہ ٹیچر نے جو کہا ہے وہ ٹھیک ہے کہ نہیں؟

اور اس شام کو طفلستان کے سائنس دانوں نے فیرو کو گھیر لیا۔ کچن میں سے ایک پرانی چھری لی گئی ــــ جب فیرو کی دُم پر چھری چلائی جانے لگی تو وہ ہر بڑا کے بھاگا۔ لیکن چاروں طرف سائنس دانوں کا گھیرا تھا۔ آخر اس نے ایک بچے کو کاٹ کھایا۔ دوسرے نے اسے بچانے کے لیے پاس ہی سے اینٹ اٹھا کر دے ماری۔ پھر ایسی جنگ میں جو نتیجہ ہو سکتا تھا وہ ہوا۔ ہمارا فیرو بہت سورما دشمنوں کے ہاتھوں شہید ہو گیا۔

ہمیں اس المناک حادثے کا ایسے پتہ چلا کہ اس شام دیر گئے تک ہمارا بچہ واپس نہ آیا۔ تلاش کرنے پر وہ باغ کے ایک کونے میں فیرو کی لاش کے پاس روتا ہوا پایا گیا۔ اب سارا گھر سوگ میں تھا۔ دو چار دن تو واقعی بہت سونے گزرے۔ پھر آہستہ آہستہ تو زخم بھر ہی جاتا ہے۔

اور اس طرح ہماری صاحبی کا پانچواں کان چوتھے کان کی بھینٹ ہو گیا اور شاید یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے بعد ہم نے کبھی پانچویں کان کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہم اب چار کانوں والی صاحبی سے ہی مطمئن ہیں۔

ہم گھر ساجن آئے

ویسے تو بات کئی سال تک لٹکتی رہی لیکن جب فیصلہ ہوا تو ایک دم ۔ اتنی جلدی کہ نزدیکی رشتہ داروں کو خاطر خواہ نوٹس بھی نہ دیا جا سکا۔ "لو میرج" میں یہی بات ہوتی ہے۔ فیصلوں کی ڈوری ماں باپ کے ہاتھوں سے نکل کر لڑکے لڑکی کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ جب وہ مناسب موقع سمجھیں شادی کر لیں گے۔ کوئی لگن وگن نہیں کوئی مہورت نہیں، کوئی ڈھول باجا نہیں — یہ آج کل کی شادیاں تو بس گویا گائے بھینس خریدنے کی بات ہو گئی۔

رائے صاحب طبیعت کے ذرا گرم تھے۔ اور گھر میں سب لوگ ان سے ڈرتے تھے۔ اس لیے جب موہن کو ایک لڑکی سے پیار ہو گیا تو وہ ڈرتا تھا کہ بات باپ تک نہ پہنچے۔ لیکن بڑوں نے کہا ہے کہ عشق اور مشک چھپ نہیں سکتے۔ جب انھیں اس معاشقے کا پتہ چلا تو ان کا بلڈ پریشر ہونے کو آیا۔ لیکن پھر بیوی نے سمجھایا کہ جوان بیٹے کا معاملہ ہے اور پھر یہ کوئی نئی بات تو نہیں ہے۔ ان کی دونوں لڑکیوں کی

شادی بھی تو پہلے ایسے ہی ہوئی تھی جب اپنے لڑکے کی بات ہوئی ہے تو کس منہ سے راستہ روک سکتے؟
رائے صاحب نے چار و ناچار اصول کو تو مان لیا لیکن پھر اس بات پہ تل گئے کہ لڑکی کو دیکھ کر ہی وہ اجازت دے سکتے ہیں۔ بیوی نے پھر سمجھایا کہ آپ تو چاہے لڑکی گنجی، کانی، لولی ہو ہمیں تو گھر کی لکشمی بنا کر ہی لانا ہوگا۔ اس دلیل کے آگے بھی انھیں آخر ہتیار ڈالتے ہی پڑے۔ اور کہاں تو وہ رضامند نہیں ہوتے تھے اور کہاں یہ کہ پیچھے پڑ گئے۔ بھئی! اب لے آؤ گھر لڑکی کو جب وعدہ کر لیا تو بات پوری کرلو۔" اب یہ حال تھا کہ پچھلے دو سالوں سے وہ اصرار کر رہے تھے اور موہن کہے جا رہا تھا کہ ابھی وقت نہیں آیا۔ اور تھا بھی وہ ٹھیک۔ رائے صاحب تو اب نام کے ہی رائے صاحب رہ گئے تھے۔ وہ کارخانے، وہ کوٹھیاں، وہ باغات ـــ وہ سب پاکستان میں رہ گئے تھے۔ اور اب ان کے پاس اس ریاست اور امارت کی صرف یاد ہی رہ گئی تھی۔ یہاں آکر کچھ بزنس شروع کیا، لیکن پھر سیلابوں میں ایسی چوٹ لگی کہ اب کسی چیز کو ہاتھ لگانے سے دل ڈرتا تھا۔ وہ تو شکر ہوا کہ لڑکیاں خود بہ خود ٹھکانے لگ گئیں اور داماد سب ایک سے بڑھ کے ایک شریف اور اچھے عہدوں پہ فائز مل گئے۔ نہیں تو نہ جانے کیا کیا کرنا پڑتا۔ اب موہن نے پڑھائی ختم کر کے نوکری کر لی تھی اور اس کی آمدنی سے گزارہ ہو رہا تھا۔ رائے صاحب کہتے تو تھے بیٹا شادی کر لو لیکن جو ڈھائی سو اسے ملتے تھے اس سے اس چھوٹے سے کنبے کا گزارہ مشکل ہی سے ہوتا تھا۔ بہو بھی آگئی تو بوجھ بڑھے گا ہی۔ نئی نویلی دلہن کے لینے جاؤ ـــ اور پھر پتہ نہیں ساس سسر کے ساتھ رہنا پسند کرے یا نہ کرے۔ موہن اسی لیے شادی ملتوی کیے جا رہا تھا کہ یا تو اسے کوئی بہتر نوکری مل جائے یا رائے صاحب کو کچھ ادھر اُدھر کسی فرم میں منیجری مل جائے تو ذرا خوش حالی ہو جائے۔ ورنہ شادی شاید خانہ آبادی نہ ہی ثابت ہو۔ ان حالات سے سب کو آگہی تھی۔ لیکن کوئی بھی یہ بات منہ پر نہ لاتا۔ رائے صاحب

کہنے کو تو کہتے کہ شادی ہو جائے. لیکن دل ان کا یہی کہتا تھا کہ صورتِ حال بہتر ہو جائے تو اچھا ہے. ان کی بیوی جمنا خاموش تھی. جب دن بیٹا کہے گا وہ تیار رہے وہ بھی ڈولی لینے چل پڑے گی. جب لڑکے نے خود لڑکی چنی ہے تو باقی حالات کو بھی تو سمجھتا ہوگا. داماد وں سے اکثر اس بات کا ذکر ہوتا. زیادہ تو خط و کتابت میں ہی ــــ تو وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار بڑے گول مول لفظوں میں کر دیتے. کیونکہ وہ سب لوگ ابھی تیس برس کے ارد گرد ہی تھے. اس لئے عموماً مذاقاً وہ یہی صلاح دیتے کہ بھئی! جلدی کیا ہے تھوڑی دیر اور آزادی کا مزہ لے لو پھر ساری عمر تو بیوی کی غلامی ہی ہے.

اس لیے جب اچانک داماد وں کو خط ملے کہ شادی پندرہ دن کے اندر اندر ہو رہی ہے تو سب کو حیرانی ہوئی. ایک داماد کلکتہ میں، ایک مدراس میں اور ایک یو پی میں. اتنی تھوڑی نوٹس سے تو شاید انھیں چھٹی بھی نہ مل سکے. لیکن موہن نے سب کو لکھ دیا تھا کہ آپ نہ آئے تو شادی نہیں ہو گی. لڑکی والوں کے گھر پہلی شادی تھی اور وہ پرانے قسم کے لوگ تھے. انھوں نے لکھا تھا کہ بارات میں تین سو آدمی ہونے چاہئیں. ادھر موہن نے اس مانگ کو "نان سنس" کہہ کر رد کر دیا تھا. اس کا دامادی فیصلہ یہ تھا کہ شادی روایتی شادی نہیں ہو گی. بیس آدمیوں سے زیادہ لوگ نہیں آئیں گے. انتظامات بہتر ین ہونے چاہئیں.

رلئے صاحب کا چھوٹا سا گھر ــ اور اس میں شادی پہلے بیٹے کی شادی! لیکن ان کے لیے تو جیسے پردیس کا معاملہ تھا. باپ کا دل کیا کیا رونق نہ کرنے کو کرتا ہو گا لیکن شادی سے دو دن پہلے حال یہ تھا کہ کسی کو شک بھی نہ ہو سکتا تھا کہ اس گھر میں شادی ہونے والی ہے.

شانتا اور سروپ شادی سے ایک دن پہلے پہنچ گئے. ان کے آنے کی امید ان لوگوں کو کم ہی تھی لیکن موہن کو یقین تھا. وہ پہلے مہمان تھے. اسی دن شام کو چھوٹی بہن بھی پہنچ

گئی۔ اس لیے بتایا کہ اس کا خاوند سدھیر سیدھا برات والے گھر پہنچے گا۔ چھٹی کم تھی اس لیئے بہن اکیلا ہی چلی آئی۔ گھر کے ان لوگوں کے علاوہ موہن نے اپنے دو تین دوستوں کو بھی مدعو کر رکھا تھا باقی کے مہمانوں کو سیدھا لڑکی کے گھر ہی پہنچنے کے لیے کہہ دیا گیا تھا۔

شہر میں موہن کا رسوخ کافی تھا۔ اس لیئے اس نے برات لے جانے کے لیے تین چار کاروں کا بندوبست کر رکھا تھا۔ میونسپلٹی کے ہیلتھ افسر سے کہہ کر گلی اور مکان کے باہر صفائی بھی کروالی تھی۔ مہتر ساتھ ساتھ صفائی کرتے ساتھ ساتھ اونچی آواز میں دعائیں اور مبارک باد دیتے جاتے تھے۔ اس طرح شاید وہ سمجھتے تھے کہ بخشش زیادہ مل جائیگی ایک مہتر تو بار بار آکر کہتا۔ "بابو شادی کیا ہے بس میٹھی عمر قید ہے۔ اب آپ کی آزادی گئی"۔ موہن کو یہ میٹھی عمر قید والی بات بہت پسند آئی۔ آتا جاتا یہی دہراتا۔ "ہمیں تو میٹھی عمر قید ملنے والی ہے" شادی کے تمام انتظامات موہن خود ہی کر رہا تھا۔ رائے صاحب کی صحت ایسی نہ تھی کہ وہ زیادہ اندر باہر آجا سکیں۔ اور داماد شہر اور یہاں کے لوگوں سے ناواقف تھے۔ سردیپ نے ایک دو بار چیک کر لیا تھا کہ کیا کیا انتظامات کئے گئے ہیں۔ اسے صرف ایک ڈر تھا کہ جن لوگوں نے کار دینے کا وعدہ کیا تھا، ان میں سے شاید ایک آدھ پھسل جائے۔ اسے تجربہ تھا کہ کاروں والے ذرا مشکل سے ہی اپنی کار دیتے ہیں۔ آخری وقت کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیا اور اپنی کار بچالی لیکن شادی کا معاملہ ہے۔ اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوگئی تو تمام انتظامات درہم برہم ہو جائیں گے برات صبح سات بجے نکلنا طے پائی تھی تاکہ دس بجے تک لڑکی والوں کے شہر پہنچ جائے۔

ویسا ہی ہوا جیسا کہ سردیپ کو ڈر تھا۔ صبح صبح سب لوگ تقریباً تیار ہو چکے تھے اور کار ابھی تک ایک بھی نہ آئی تھی۔ سردیپ بار بار کہہ رہا تھا۔ بہتر ہے سب لوگ بس پر چلیں کم از کم جانا یقینی تو ہوگا لیکن موہن ہر بار جواب دیتا۔ بھیا آپ فکر نہ کریں ایسی ویسی بات کوئی نہیں۔ آخر سات بجے ایک بڑی کار آگئی۔ دوسرے لوگوں نے

کوئی بہانہ لکھ کر معافی چاہی تھی۔ وہ تو شکر ہوا کہ وہ لوگ صرف سات ہی تھے اور بڑی کار میں کسی نہ کسی طرح گھس گھسا کے بیٹھ سکتے تھے۔ موہن نے اپنے ایک موٹر سائیکل والے دوست کو بھی مدعو کر رکھا۔ چھوٹا بھائی اس کے ساتھ بیٹھ گیا اور یہ چھوٹی سی خاموش سی برات چل پڑی۔

دوسرے شہر میں بینڈ باجے سے کچھ شادی کا سماں بندھ گیا۔ لڑکی والوں نے خاص تیاری کر رکھی تھی۔ وہاں کچھ لوگ پہلے ہی سے ایک طے شدہ مقام پر پہنچ چکے تھے وہ بھی برات کے ساتھ مل گئے اور اب برات میں ۲۰۔۲۵ آدمی ہو گئے تھے۔ ان میں چھوٹی لڑکی کا خاوند سدھیر بھی تھا۔ اس کے آنے سے سب لوگوں کو بڑی خوشی ہوئی۔ سدھیر سے برات کی رونق دوبالا ہو گئی۔ بات بات میں مذاق، قہقہے، خوش گپیاں۔ سروپ کو یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ اسے چھٹی مل گئی ہے اور وہ برات کے ساتھ واپس جا سکے گا۔ لیکن سب سے بڑی لڑکی اور اس کا خاوند نہ آسکے۔ انھیں تو موہن کے خلاف شکوہ بھی تھا۔ ایسے وقت شادی مقرر کی جب خود ان کے ہاں ایک چھوٹا سا نیا مہمان آنے والا تھا۔ بھلا وہ کیسے گھر سے نکل سکتے تھے؟ موہن کے دو چار دوست، چچا، کوئی دور کے رشتہ دار — کافی رنگ برنگ قسم کے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ ہندوستانی برات تو سرکس کے جوکروں کا جلوس سا ہوتا ہے، رنگ برنگ کے کپڑے۔ امیر اور غریب رشتہ داروں کا سنگم۔ بچے اور بوڑھوں کا میلہ۔ اور اس برات میں تو انی گنی کچھ عورتیں بھی تھیں۔

سروپ کی ایک ودھوا چچی اپنے بچوں سمیت اسی شہر میں رہتی تھیں۔ موہن نے رشتے کا خیال رکھتے ہوئے پہلے ہی انھیں شادی میں آنے کی دعوت دے رکھی تھی۔ سروپ اور اس کی بیوی شانتا اور کچھ اور لوگ پہلے وہیں گئے۔ چچی ویسے ہی عام کپڑوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اٹھ کر بڑے تپاک سے سب سے ملیں۔ شانتا نے پوچھا

"تجی آپ تیار نہیں ہوئیں؟ جلدی کیجئے سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں" اور پھر کمرے کی طرف دیکھ کر پوچھا "بلو کہاں گیا ہے؟ باقی کے لوگ کدھر ہیں؟"

بلو چاچی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ اب تو پروفیسر بن چکا تھا۔ چاچی نے قدرے اداسی سے جواب دیا۔

"کیا معلوم بیٹی وہ تو آج تڑکے ہی کہیں چلا گیا۔ کہنے لگا مجھے امرتسر جانا ہے کوئی ضروری کام ہے۔"

"بڑا بدتمیز ہے" سروپ پیار سے غرایا۔ "اسے معلوم تھا کہ آج ہمارے سالے کی شادی ہے اور وہ یہاں سے بھاگ گیا۔ ہم تو شادی پر آئے ہی اسی لیے تھے کہ اس سے برسوں بعد آج پھر ملاقات ہو جائے گی۔ اچھا اٹھیے آپ تو تیار ہو جائیے۔"

چاچی نے وہیں بیٹھے بیٹھے کہا "نہیں بیٹا میں نہیں آ سکتی۔ میرا آنا بنتا نہیں"

"بنتا نہیں؟" سنتا نے عذر کو ٹھکراتے ہوئے پوچھا "یہ کیسے؟ چلیئے اٹھیئے۔ ساری برات آپ کو بلانے آئی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے برات کی طرف ایسے اشارہ کیا کہ کوئی بھی اپنے آپ کو شہزادی سمجھنے لگتا۔ "نہیں بیٹا —— میں نہ آ سکوں گی۔ مجھے معاف کر دو" چاچی کے جواب میں اتنی قطعیت تھی کہ سروپ کو حوصلہ نہ پڑا کہ پھر اصرار کرے۔ لیکن اسے بہت غصہ آیا۔ یہ عذر حد درجہ نامعقول تھا۔ ان کا آنا بنتا کیسے نہیں تھا؟ —— چاچی کا اشارہ کس طرف تھا؟ رشتے کی دوری کی طرف یا اپنے ودھواپن کی طرف۔

اور چاچی کو جیسے معلوم ہو گیا کہ سروپ کیا سوچ رہا ہے۔ اس نے کہنا چاہا غصہ مت کرو بیٹا۔ تم کیسے سمجھ سکتے ہو میرے نہ آنے کی وجہ۔ آج کتنے سال ہو گئے ان کو گزرے ہوئے۔ یہ بلو جو آج پروفیسر ہے اس وقت صرف بارہ سال کا تھا۔ ایک ایک گھڑی گن کر اسے بڑا کیا ہے اور آج وہ اپنے باپ کی جگہ کھڑا ہے۔ وہ بھی پروفیسر

ہی تھے اور ملو بھی آج پروفیسر ہے۔ وہ جب کالج جانے کو تیار ہوتا ہے اور اپنا گاؤن اٹھاتا ہے تو بالکل اپنے باپ کی طرح ہی لگتا ہے اور پھر شام کو جب تھک کر واپس آتا ہے اور کتابیں پھینک کر چائے مانگتا ہے تو گویا مجھے گزرے ہوئے سال واپس مل جاتے ہیں۔ میں اسے دیکھ دیکھ کر جیتی ہوں۔ پندرہ سال پہلے چیا اپنی زندگی میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے چیتا میں جلتی ہوئی دیکھی تھی، اسے میں نے پھر آہستہ آہستہ اپنے خون سے سینچ کر خود جلایا ہے۔ یہ پندرہ سال میں نے گھل گھل کر بتائے ہیں اور میں نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اب جب تک ملو کی شادی نہ ہو جائے میں کسی شادی میں شریک نہ ہوں گی۔ ہر شادی مجھے ان کی یاد دلاتی ہے۔ میں کسی کی شادی میں موت کا خیال لے کر کیسے جا سکتی ہوں؟ مجھے کیا حق ہے کسی کی شادی میں ایسے خیالات لے کے جاؤں؟ میں ندھوا ہوں میں نے بہت بچے کھوئے ہیں۔ جب بچے بچنے لگے تو اپنا خاندان کھو دیا۔ میں بدقسمت ہوں میں کبھی ہوں کسی شادی میں اپنا سایہ ڈالنا نہیں چاہتی۔ تمہیں خود ہی مجھے نہ ملانا چاہیے تھا...... پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آکر تھم گئے۔ وہ بولی "ہاں بیٹا شادی مبارک ہو" پھر کچھ لمحوں کے بعد کوشش کر کے مسکراتی ہوئی بولی ــــ "برا نہ مناؤ، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں نہیں آ سکتی"!

سردیپ واپس آگیا۔ برات ایسے ہی چل پڑی۔ ندھوا کو چھوڑ کے سہاگنوں کو ساتھ لے کر۔ سدا سہاگن! چاچی کو بھی کبھی ایسا ہی کہا جاتا تھا!

"ملنی" کی رسم ہوئی۔ رائے صاحب کو سمدھی نے بھینچ لیا اور پھر اوپر اٹھا لیا۔ پھر جانے کتنے روپے اُن کی جیب میں ڈال دیے۔ سب لوگ ہنس رہے تھے۔ کوئی پھبتیاں کس رہا تھا، کوئی مذاق کر رہا تھا۔ چند دوست آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے "کیا بیہودہ قسم کی رسمیں" ہیں۔ وہ غالباً کہہ رہے تھے۔

ہر ذی حس انسان کو رسم و روایات میں بیہودگی اور فرسودہ پن نظر آتا ہے۔

جب تک کہ وہ خود آہستہ آہستہ ان کا شکار نہ ہو جائے۔

چائے پیتے وقت رائے صاحب غیر معمولی طور پر خاموش اور سنجیدہ ہو گئے تھے کیا شرپ کی چاچی کے "نہ" کہنے سے انھوں نے برا منایا تھا؟ نہیں انھوں نے تو بات شاید پوری سنی بھی نہیں تھی۔ صبح سے جب دو کار والوں نے وعدہ کر کے کاریں نہیں بھیجی تھیں، وہ کچھ خاموش سے تھے۔ انھوں نے ایک بار موہن سے کہا بھی تھا: "کیا فائدہ کار مانگنے سے؟ بغیر کار کے شادی نہیں ہو سکتی کیا؟ بس میں کیوں نہیں چلتے؟" اور اپنی بات پوری کرنے سے پہلے اور موہن کا جواب سننے سے پہلے ہی وہ دوسرے کمرے میں چلے گئے تھے۔ ہاں کار کے بغیر شادی کیوں نہیں ہو سکتی؟ بس اس فقرے نے گویا یادوں کے سیلاب کے کواڑ کھول دیئے ہوں۔ ان کی بھی تو شادی ہوئی تھی۔ کیا شان تھی! کیا آن بان تھی۔ سینکڑوں براتی تھے۔ کئی دن پہلے ہی سے لوگ جمع ہو گئے تھے۔ موٹروں کا ایک کارواں تھا۔ برات تیار تھی۔ اس وقت رائے صاحب جو اس وقت صرف کرم چند تھے بسور پڑے تھے۔ میں تو شادی میں تب چلوں گا جب میری اپنی کار علیحدہ ہو گی بالکل نئی فورڈ اور باپ نے اسی وقت کسی کو بازار بھیج کر ایک نئی کار منگوا دی تھی۔ ایسے جیسے کسی ضدی بچے کے لیے کھلونا خریدنا ہی پڑتا ہے تیس سال ہو گئے تھے اس بات کو کیا معمولی سی مانگ لگتی تھی اس وقت اور پھر یہ چکر 'آزادی' ملک کی تقسیم، فیکٹریوں کو آگ، گھروں کا لٹ جانا اور جب وہ سرحد کے اس پار پہنچے تو یہی خوش قسمتی سمجھی جاتی تھی کہ عزت تو بچ گئی ......

آج رائے صاحب اپنے سب سے بڑے لڑکے کے لیے ٹیکسی بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو کوس رہے تھے کہ کیوں انھوں نے موہن کو برا بھلا کہا۔ آج تو اس کا شگون بھرا دن ہے۔ باپ اگر اس کے لیے اور کچھ نہیں کر سکتا تھا تو کم از کم خاموش تو رہ سکتا تھا۔

جمنانے رائے صاحب کو کھویا کھویا سا دیکھا تو کہنی مار کر دھیرے سے پوچھا۔
"کیا بات ہوگئی ہے؟ اتنے خاموش کیوں بیٹھے ہو۔ آج تو تمہارے موہن کی شادی ہو رہی ہے۔ باہر جو باجا بج رہا ہے اس کی شادی کا ہے۔ کچھ ہنسو، کچھ بولو۔ لوگ کیا سوچیں گے؟"

"نہیں صرف یہی سوچ رہا تھا کہ مجھے موہن کو کچھ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ مجھے اپنے دن یاد آگئے تھے۔ جب میں تمہیں لینے گیا تھا۔ میں نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ جاؤں گا تو نئی اور اپنی کار میں، نہیں تو شادی نہیں کروں گا۔ اور اس وقت یہ حالت تھی کہ پانچ منٹ کے اندر باپ یہ شرط مان گیا۔ اور آج ــــ میں سوچ رہا تھا اگر ایک کار بھی نہ آتی تو ہمارے پاس تو ٹیکسی کے لیے بھی پیسہ نہ تھا۔"

"چھوڑو ایسی باتوں کو۔ سب قسمت کی بات ہے۔ آپ بیتے زمانے کا خیال ہی کیوں کرتے ہیں؟ اب بھی ہم کئی لوگوں سے اچھے ہیں۔" یہ دلیرانہ دلاسہ دے کر جمنا نے دوسری طرف منہ پھیر کر چپکے سے ساڑی کے پلّو کے ساتھ اپنے آنسو پونچھے۔ کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا "بیتے دنوں کا خیال مت کرو" لیکن یہ کہتے ہی اس کے دل کا چور پکڑا گیا تھا۔ وہ خود کیا کر رہی تھی؟ رائے صاحب تو شاید آج صبح سے یا ایک دو دن سے سوچ رہے ہوں گے۔ وہ تو اسی دن سے سوچ رہی تھی جب سے یہ سوال پیدا ہوا تھا کہ بہو کے لیے کیا بنوایا جائے۔

کتنے دنوں سے اس کی راتوں کی نیندیں حرام ہوگئی تھیں۔ ایک زری کی ساڑی اور گلے کا ہار۔ بس اسی کے سر پہ بہو گھر لائی جائے گی! جب وہ خود آئی تھی تو کیا کچھ نہ آیا تھا لڑکے والوں کی طرف سے۔ اور پھر ایک ایک کر کے سب گہنے بک گئے تاکہ وقت سے گزارا ہو سکے اور آج اس کے پاس گروی رکھنے کے لیے کوئی ایک زیور بھی نہ تھا ہو تو گھر سے کافی کچھ لائے گی لیکن یہ تو اور بھی شرم کی بات تھی کیا سوچے

گی ہم کیسے رائے صاحب کے گھر میں آئی! موہن نے اسے سب کچھ بتا دیا ہوگا اور پھر جیسے ایک ساتھ ہی دونوں کا دھیان دوسری طرف لگانے کی کوشش میں اس نے چائے دانی اٹھا کر چائے کا پیالہ بنانا شروع کر دیا: لو تھوڑی چائے اور پی لو۔ اور اب سوچنا بند کرو۔ انھیں چائے بناتا دیکھ کر ایک بیرا مٹھائی کی ٹرے لے آیا۔ جمنا نے ایک پیسٹری اٹھالی۔ بھوک تو نہیں تھی لیکن دکھانے کے لیے تو کچھ نہ کچھ کھانا ہی چاہیے۔ ورنہ خواہ مخواہ لڑکی والے سوال پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔ آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟ آپ نے کچھ کھایا نہیں وغیرہ وغیرہ۔

ادھر سدھیر نے چائے کا گھونٹ پیا تو ایک دم منہ خراب ہو گیا۔ چائے کو شاید دھواں لگ گیا تھا۔ وہ دولہا کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے سہروں کو پرے کرتے ہوئے بولا۔ "بیٹا اپنے سسرال والوں سے میری شکایت کر دینا۔ کم از کم چائے تو ٹھیک بنانے نہیں تو اس شادی میں صرف چائے سے ہی غرض ہے۔ باقی کا مال تمہارا ہے۔" کانتا نے جو اس برات میں جو دھرائین بنی ہوئی تھی اور چاہتی تھی کہ ہر بات سلیقے سے ہو، سدھیر کے کوٹ کا پلّہ کھینچتے ہوئے کہا — "آہستہ بولو یہ سناروں کی برات نہیں، ایسی باتوں کی شکایت تھوڑا ہی کرتے ہیں۔"

"بالکل میم صاحب!" — سدھیر بولا "اسی لیے تو ہم نے اپنی شادی پر پارٹی بھی نہیں کروائی تھی۔ نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری۔"

"اوہ آپ کی شادی کی کیا بات تھی — بس جیسے بھگا کر لائے ہوں۔" —

اور ہوئی بھی ایسے ہی تھی وہ شادی۔ ہر انسان کے کچھ آدرش ہوتے ہیں اور سدھیر کا آدرش تھا کہ شادی نجی معاملہ ہے اس میں کسی قسم کا شو بیہودہ اور فضول ہے وہ پتا جی کے ساتھ گیا تھا۔ سول میرج کے لیے اس نے نوٹس پہلے ہی دے رکھا تھا لیکن جب مجسٹریٹ کے پاس پہنچے تو معلوم ہوا کہ ابھی نوٹس کی میعاد پوری نہیں ہوئی جب اور کچھ نہ

سوچا تو پاس والے ایک گوردوارے میں چلے گئے۔ آدھ گھنٹے کے بعد باپ بیٹا اور بہو بس میں بیٹھ کر واپس آ گئے تھے۔ یہ تھی اس کی انوکھی شادی اور یہاں یہ گھما گھمی یا!

"ارے بھئی! اگر روایتی شادی میں آئے ہیں تو ہمارا رویہ بھی روایتی براتیوں کی طرح ہونا چاہیے۔ کیوں سالی کیا خیال ہے تمہارا؟"۔۔۔ اس نے شانتا کو آنکھ مارتے ہوئے پوچھا: "ٹھیک ہے بیٹا" شانتا نے جواب دیا۔ ان دونوں کی آپس میں ایسے ہی بات چیت ہوتی تھی۔ کبھی سیدھے طریقے سے ایک دوسرے کو نہ بلاتے تھے۔ مختلف قسم کے رشتے نکال کر وہ ایک دوسرے کو ایسے پکارتے کہ کئی بار سننے والے دنگ رہ جاتے۔

اور پھر شانتا نے اپنی شادی شدہ زندگی کے چھ سالوں کو پرے دھکیلتے ہوئے سروپ کے جوان چہرے کو دیکھا اور اس سے پوچھا۔۔۔ "کچھ یاد ہیں آپ کو بھی اپنی شادی کی باتیں؟"

"ہاں ہاں! میں سوچ ہی رہا تھا" سروپ ایسے بولا جیسے شانتا نے اس کے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا ہو۔ اس نے کہاں سے سوچنا شروع کیا تھا؟ شادی اسے بھی پہنے کے دلوں سے چاچی کی شادی سے جب وہ چھوٹا سا بچہ تھا اور اسے چاچی کی گود میں بٹھا یا گیا تھا۔ ماموں کی شادی میں جب وہ کچھ بڑا تھا اور بھیا کی شادی کے بارے میں جب وہ کالج میں پڑھتا تھا اور پارٹی کے تمام انتظامات کے لیے ذمہ دار تھا۔ شانتا۔ سے کیسے ملی، کیسے ان کی جان پہچان ہوئی!! اور پھر چھ سال کی کورٹ شپ جس میں کئی قسم کے نشیب و فراز آئے اور کئی بار تو کہنے والوں نے کہا کہ یہ بیل منڈھے نہیں چڑھے گی۔ لیکن بیل منڈھے چڑھ ہی گئی۔ کیسی عجیب قسم کی شادی تھی؟ اس کا فیصلہ تو یہ تھا کہ کوئی رسم نہیں ہو گی۔ لیکن پھر بزرگوں کی خاطر کچھ رسمیں بھی کی گئی تھیں۔ لیکن لین دین بالکل نہ ہوا تھا۔ یہ اس کا جہیز کے خلاف پروٹسٹ تھا۔ ان

سب شادیوں کے خلاف جن میں وہ براتی بن کے گیا تھا اور جن میں لڑکی والوں نے کمر توڑ زور لگا کر اپنی بساط سے زیادہ جہیز دینے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آج بھی تو جہیز لیا جا رہا تھا۔ خیر اپنی اپنی مرضی کی بات ہے۔ اس نے سوچا میرا کام ساری دنیا کو تھوڑا ہی ٹھیک کرنا ہے اور پھر ہر موقع کی اپنی نزاکت ہوتی ہے۔ موہن کی سسرال ایسے لوگوں سے تو جہیز لینا ہی چاہیے۔ ہاں اس نے خود موہن سے پوچھا تھا "کیوں بھئی! کیا کیا لے رہے ہو؟" شاید اس نے یہ سوال ایک ہی بار کسی سے پوچھا تھا اور موہن کا جواب سن کر بولا تھا "چلو اچھا ہے۔ کچھ مانگو مت۔ جو مل جائے ٹھیک ہے۔"

شانتا سروپ کے جواب کا انتظار کرتی رہی۔ جب کچھ جواب نہ ملا تو پھر بولی۔ — "وہ وقت یاد ہے جب میں نے آپ کو جے مالا پہنائی تھی؟"

"اور میرے جوتے تمہاری سہیلیاں اور بہنیں چرا کر لے گئی تھیں" سروپ نے قدرے درشتی سے جواب دیا۔ اگر اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹنا ہی تھا تو ایسے ہی کیوں نہ ٹوٹے۔ "سچ۔ سچ — کیا بات یاد آئی تمہیں بھی"۔ شانتا نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اسے آج تک کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ کس وقت کس جگہ اور کس موڈ میں سروپ مذاق کرے گا۔

کمرے سے منہ بسورتے ہوئے ونود نکلا اور بولا — "میری دلہن کہاں ہے؟ آپ نے کہا تھا مجھے دلہن ملے گی۔"

"ارے وہ تو ہم بھول ہی گئے۔" ونود سروپ اور شانتا کا پانچ سالہ بچہ تھا سب کو شادی کے متعلق باتیں کرتے دیکھ کر اس نے شادی سے دو دن پہلے ہی پوچھا تھا۔ "شادی کیا ہوتی ہے؟" سروپ نے جواب دیا تھا "شادی میں دلہن ملتی ہے۔"

"دلہن کیا ہوتی ہے؟"

"لڑکی — خوب صورت لڑکی۔ بڑے اچھے کپڑے پہنے ہوئے۔"

"ماما کو لڑکی کیوں ملے گی؟"

"کھانا پکانے کے لیے۔"

"کھانا تو نانی اماں پکا لیتی ہیں۔"

"کھیلنے کے لیے۔"

"ہمارے ساتھ تو ماما کھیلتے نہیں تو دلہن کے ساتھ کیا کھیلیں گے؟"

"بھئی تم تو بہت چھوٹے ہو۔"

"اچھا تو ہمیں بھی ایک دلہن لادو۔"

"ضرور" سروپ نے وعدہ کیا۔"جب ماما کی شادی ہو گی تو تم بھی کوئی لڑکی پسند کر لینا ۔۔۔ اس کے ساتھ تمہاری شادی کر دیں گے۔"

یہ وعدہ لے کے ولو دبرات کے ساتھ آیا تھا اور جہاں باقی لوگ اِدھر اُدھر اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے ولو دبچوں کے جھنڈ میں اپنی دلہن ڈھونڈ رہا تھا اور آخر ایک لڑکی کو پکڑ کر دو ساتھ لے آیا اور سروپ سے بولا۔"ہم اس سے شادی کریں گے۔"

لڑکی ذرا بڑی سی تھی۔ سروپ نے اس سے پوچھا "کیوں بیٹی اس لڑکے سے شادی کرو گی؟"

اور لڑکی جواب دینے کے بجائے دہاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ سروپ بہت سٹپٹایا بہت چپ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی آواز بینڈ سے بھی زیادہ اونچی تھی۔ تھوڑی دیر میں آواز سن کر کہیں سے اس کا باپ بھی نمودار ہو گیا۔ سروپ نے اس سے پوچھا "کہاں رہتے ہیں آپ بھائی صاحب"۔۔۔۔ "جالندھر ۔۔۔ کیوں فرمایئے؟"

"نہیں ویسے ہی پوچھا تھا۔ ہمارے بچے کو آپ کی لڑکی پسند آگئی ہے اب ہمیں وہیں آنا پڑے گا۔"

وہ تو خیر ہوئی اس آدمی کا ذوق اچھا تھا، ورنہ بات کا بتنگڑ بن جاتا۔ وہ نہایت اطمینان

سے بولا "ضرور" اور ونود کو ایک ٹافی دیتے ہوئے بولا "اچھا بیٹا بات پکی ہو گئی۔"

"کیا ہوا؟" ونود نے سروپ سے پوچھا۔

"یہ کہہ رہے ہیں کہ ماما کی شادی کے بعد تم لوگ جالندھر آ کر دلہن کو لیجا سکتے ہو۔"

"کب جائیں گے جالندھر؟"

"کل"

"کل نہیں، ابھی۔" ونود نے اصرار کیا۔

"اچھا پہلے ٹافی ختم کرلو، پھر چلیں گے۔" اور سروپ نے تھپکی دے کر ونود کو چلتا کیا۔ شانتا نے جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی گھور لگائی۔

"بالکل باپ پر گیا ہے۔ ابھی سے یہ لچھن ہیں۔"

"ہاں خون کا اثر ہے" سروپ نے یہ بات ایسے کہی جیسے سارا اثر ماں کے خون کا ہی ہو۔ شانتا بے چاری چپ ہو گئی۔

پھیرے ختم ہو چکنے کے بعد کھانا کھانے کے لیے دلہن کو بھی موہن کے پاس برات کے ساتھ ہی بیٹھا دیا گیا۔ براتی کھانا کھا رہے تھے اور چاروں طرف لڑکی والے لوگ گھیرا ڈالے ہوئے تھے۔ سب کی نظریں جوڑے پر ہی تھیں۔ چلمنوں کے پیچھے سے عورتیں اور لڑکیاں جمگھٹا بنائے کھڑی تھیں۔ وہاں سے چوڑیوں کی آواز نسوانی کھسر پھسر کھسیانی ہنسی میں مل کر آ رہی تھی۔ ایک لڑکی کا مذاق اور دوسری کا احتجاج۔ ایک نے دھکا دے کر کہا "جا ئے گے جا کر اچھی طرح دیکھ لے"۔ دوسری بولی "ہائے ہائے تیری بھی سنا دی ہو جائے گی کسی کالے کلوٹے کے ساتھ۔" تیسری نے کہا "اوئی، کتنی بے شرم ہے۔" اور اس کا چہرہ خود شرم سے لال ہو گیا۔ ایک بوڑھی سی عورت نے پنجوں کے بل کھڑی ہو کر کہا "ارے دولہا تو کہیں دکھائی نہیں دیتا۔" اس جمگھٹے میں ہر عمر کی عورت شامل تھی کنواری بیاہتا اور رودھوا ــــ خوب صورت و بدصورت خوش و ناخوش، سبھی تھی کبھی

کن انکھیوں سے ان کی طرف دیکھ لیتا۔ یہ نظارہ ہر شادی میں دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک ادھیڑ عمر چالاک سی قدرے بدصورت عورت نے کچھ اونچی آواز میں کہا ــ" کیا سندر جوڑی ہے"ـــ یہ شاید نفسیاتی فارمولا ہے جو ہر شادی میں کوئی نہ کوئی ضرور دہراتا ہے تاکہ لڑکی کی خوب صورتی کی توثیق ہو جائے اور برات والے اسے ذہنی طور پر بھی قبول کریں۔ جو عورتیں یہ جملہ کہتی ہیں وہ نہایت گھاگ قسم کی ہوتی ہیں اور اپنی طرف سے لڑکی والوں کے تئیں ایک فرض پورا کرتی ہیں۔

جمنا نے یہ جملہ سنا تو اس نے جوڑی کو دیکھا اور دل میں ہی بلائیں لے لیں پھر رائے صاحب سے بولی "ہمیں جلدی چلنا چاہیے۔ دلہن کے آنے کے لیے گھر میں تیل بھی تو چوانا ہے۔"

باجہ اب بھی بج رہا تھا۔ پولیس کا بینڈ ہر قسم کی دھن بجا رہا تھا۔ جہیز کا چھوٹا موٹا سامان ایک کار میں رکھا جا رہا تھا۔ دوسری کار کو دلہن کے لیے پھولوں سے سجایا گیا تھا۔ اندر سے لڑکی لائی گئی ایک طرف سے باپ اور دوسری طرف سے ماں اسے تھامے ہوئی تھی وہ لمبا سا گھونگھٹ نکالے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ اب بینڈ والوں نے دھن چھیڑی تھی "چھوڑ بابل کا گھر" دلہن سسک سسک کر رو رہی تھی اس کی ماں اور بہنیں دہاڑیں مار مار کر رو رہی تھیں۔ سب عورتیں کچھ کم کچھ زیادہ، کچھ دکھاوے کے لیے کچھ واقعی رو رہی تھیں۔

سردیپ کو چاچی کا خیال آیا۔ اور پھر ماں کا جو اکثر کہا کرتی تھی" دھوا بھی روئے سہاگن بھی روئے اور پاس کنواری کنیا بھی روئے"ـــ لیکن اس وقت، شادی کے وقت ــ برات کی وداعی کے وقت سبھی رو رہے تھے۔ چاچی کے کانوں میں بینڈ کی آواز تو آئی ہوگی ـــ کیا وہ بھی رو رہی تھی؟

پولیس کا جوان

ہم سمجھتے تھے شاید منہ کھولنے کی ضرورت نہ پڑے۔ جوں توں کر کے، اتنی کٹ گئی ہے باقی بھی ایسے ہی نکل جائے گی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنتا ایک طرف اور جنتا کے خادم ایک طرف اور بیچ میں غلط فہمیوں کا انبار بنتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت میں مناسب ہے کہ مہر خاموشی توڑ کر دلوں سے ربط پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ مجھے ہی لیجئے صبح سے شام تک کام پر لگا رہتا ہوں کڑے سے کڑے کام کرنے کے لیے تعینات کیا جاتا ہوں لیکن پھر بھی جب طرف نظر اٹھاتا ہوں بس نکتہ چین ہی نکتہ چین نظر آتے ہیں۔ چاروں طرف دیکھتا ہوں کہ شاید کوئی ہمدرد، مونس و غم خوار مل جائے جس کو حالِ دل سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لوں۔ اس حالت میں مرزا غالب یاد آتے ہیں جنھوں نے شاید ہمارے لیے ہی کہا تھا ؎

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

خیر آج تو آپ پوچھیں نہ پوچھیں میں اپنی کہہ کر ہی چھوڑوں گا۔ اور ہو یہ بھی سکتا تھا کہ آپ یہ بتانا تو میں بھول ہی گیا کہ میں کون ہوں، کیا کرتا ہوں، کہاں رہتا ہوں اور اس وقت کہاں سے آن ٹپکا۔ معاف کیجئے میں نے سوچا بہت جانا پہچانا آدمی ہوں ہر چوک، چوراہے اور گلی میں کثرت سے پایا جاتا ہوں اس لیے شاید اپنی واقفیت کروانے کی ضرورت نہ ہو۔ خیر سنیئے میری تعریف۔ میں ہوں پولیس کا جوان عمر تو خدا کے فضل سے پچاس سے اوپر ہے لیکن اپنے عہدے کے باعث ہمیشہ جوان ہی کہلاؤں گا۔ شاید سدا بہار جوانی کا یہ خطاب بھی ہمارے ساتھ ایک مذاق ہے آپ مجھے اور بھی کئی ناموں سے یاد کرتے ہیں مثلاً سپاہی، کانسٹیبل، لال پگڑی اور سنتری بادشاہ وغیرہ۔ سماج کے مشتبہ کردار اور چھوٹے موٹے لوگ ... ہمیں حضور، مائی باپ اور "سرکار" کے خوشامد بھرے لیکن کھوکھلے القاب سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ان القاب اور خطابات کے پیچھے صرف مذاق، نفرت یا خوشامد کے جذبات ہوتے ہیں اور وقتی ضروریات کے مطابق ان کو استعمال کیا جاتا ہے پھر بھی کیا کیا جا سکتا ہے؟ ہماری زندگی کی سب سے بڑی بدقسمتی شاید یہ ہے کہ عزت، محبت یا ہمدردی کے خالص انسانی جذبات سے ہم دائم المحروم ہی رہیں گے۔

اس سلسلے میں ایک چھوٹی سی کہانی یاد آگئی جو ہمارے ماموں مرحوم جو خود بھی پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل کے ممتاز عہدے پر فائز تھے سنایا کرتے تھے۔ ایک دن ان کے عزیز دوست کے ہاں بڑی مدت کے بعد ایک لال پیدا ہوا۔ قصبہ میں یہ ایک بہت بڑا واقعہ تھا جس کے لیے تمام عزیز و اقارب اور دوست احباب خوشیاں منانے اکٹھے ہوئے۔ باری باری سب نے بچے کو دیکھا اور رسمیہ طور پر تعریف کے لیے ایک دو جملے کہے۔ ہمارے ماموں بزرگوار ریٹائرڈ پرمانینٹ ہیڈ کانسٹیبل

(خداوند تعالیٰ ان کی یاوردی روح کو عرش بریں کے جوک پر جگہ دے) بہت زندہ دل اور صاف گو واقع ہوئے تھے۔ انھوں نے بچے کو بڑے غور سے دیکھا اور پھر اپنے دوست سے مخاطب ہوئے۔

"یار صاحبزادہ ابھی سے بہت چلبلا ہے بڑا ہو کر سچ کہتا ہوں بہت بدمعاش ہوگا۔"

ان کے عزیز دوست نے نہایت اطمینان سے جواب دیا "کوئی مضائقہ نہیں اگر ایسی بات ہوئی تو پولیس میں فوراً نوکری مل جائے گی۔"

اس وقت مہمانوں میں ہمارے ماموں کی یہ حالت تھی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ کئی لوگوں کا خیال ہے کہ اس واقعہ سے ان کو اتنا صدمہ پہنچا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے اور ۸۰ سال کی بے وقت عمر میں لواحقین کو روتا دھوتا چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہوگئے۔

یہ کہانی میں نے اس لیے سنائی کہ اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ ہمارے متعلق سوسائٹی کی عام رائے کیا ہے؟ دکھ تو اس بات کا ہے کہ رائے حقائق پر نہیں بلکہ تعصبات پر مبنی ہے۔

میں پبلک کا خادم ہوں اور ذرا آپ غور کیجئے کہ ان حالات میں اور کسی وقت تو صبح سے لے کر شام تک بے شمار طریقوں سے میں آپ کی خدمت کرتا ہوں اور رات کو جب آپ گھوڑے بیچ کر سوتے ہیں تو دور جاڑے میں ٹھٹھرتا ہوا میرا وجود اور نیند سے ویران ہوتی آنکھیں آپ کے اور آپ کے کنبے کی حفاظت کی خدمت ہوتی ہیں۔ وجہ یہ تو جیسا کہ میں نے عرض کیا میں ہر چوک، ہر نکڑ، ہر خطرناک جگہ پر موجود ہوتا ہوں لیکن اس وقت بھی جب میں بظاہر غیر حاضر ہوتا ہوں اور آپ مجھے دیکھ نہیں پاتے ہیں اور میرے دوسرے ساتھی آپ کے آرام اور حفاظت

کے لیے کوشاں رہتے ہیں ایسے وقت میں شاید پولیس کانسٹبل کے متعلق ہی کہا گیا ہے ؎

"ہر جگہ موجود ہے پر نہ نظر آتا نہیں"

چوری اور ڈاکہ زنی وغیرہ جیسے سنگین جرائم تو خیر ایک طرف آپ ایک چھوٹی سی مثال لیجیے بڑے بڑے شہروں میں صبح سے شام تک بے شمار ٹرافک چلتا ہے۔ ہر قسم کی گاڑیاں، مشینیں سڑک پر دندناتی پھرتی ہیں، انھیں کے بازو بہتا اور اکیلا پیدل چلنے والا بھی ہوتا ہے اور اگر چوراہے پر میرا بھائی ٹرافک کانسٹبل نہ ہو تو نہ جانے روز کے کتنے خون ہو جائیں۔ پولیس کا کام سماج کی بقا کے لیے لامحدود شخصی آزادی کو قاعدے اور ضابطے کے دائرے میں لانا ہوتا ہے اس کے علاوہ سماج کے غیر سماجی عناصر کو بھی قابو میں رکھنا پڑتا ہے۔ انسان کی ترقی اور سماجی فلاح و بہبود کے لیے انسانی زندگی کی حفاظت، قانون اور امن کا تحفظ، امن و امان کی برقراری لازمی شرطیں ہیں۔ اس لیے پولیس کا کام سماج کی زندگی کے لیے نہایت اہم ہے اور یہ ہماری روزمرہ زندگی میں اتنا گھل مل گیا ہے کہ ہم نے شاید کبھی سوچا بھی نہیں کہ اگر پولیس نہ ہوتی تو ہماری مہذب زندگی ممکن نہ ہوتی۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے فرائض ہی کچھ ایسے ہیں کہ ہم ہر ایک کو خوش نہیں رکھ سکتے۔ کسی کو سڑک کے دائیں طرف چلنے سے روکا تو اس نے آزادی اور بنیادی حقوق کے نام پہ صدائے احتجاج بلند کی۔ کسی خوش پوش جیب کترے کو رنگے ہاتھوں پکڑا تو اس نے اپنی شرافت اور خوش پوشی کے نام پر ایسا واویلا مچایا کہ پبلک سمجھتی ہے جیسے ہم ہی نے اس کی جیب کاٹی ہو۔ کسی سائیکل والے کو بغیر روشنی کے سائیکل چلانے کے جرم میں پکڑا تو وہ ایسا چلایا کہ جیسے ہم ہی نے اس کا لیمپ چرالیا ہے۔ سینما کے ٹکٹوں کے لیے ہجوم

کو قطار بندی کے لیے کہا تو لعن طعن اور طنز یہ فقروں سے فضا گونج اٹھی اور آن کی آن میں ہم قلم کے "ویلن" بن گئے۔ کسی چور کو ہتھکڑی ڈالے جب گلی میں سے گزرے تو لوگ ایسے گھور گھور کر دیکھنے لگے گویا مجرم ہم ہیں اور کسی بے گناہ کو اپنی جگہ پر تختۂ دار پر پیش کرنے جا رہے ہیں۔ جلسے جلوس میں مجمع سے راستہ کھلا رکھنے کے لیے درخواست کی تو ہائے ہائے اور مردہ باد کے ایسے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے کہ چند لمحوں کے لیے ہمیں ایسا معلوم ہوا کہ ہجوم ہماری ہی عزت افزائی کے لیے وہاں جمع ہوا تھا۔ غرض یہ کہ کہیں بھی قواعد و ضابطہ لاگو کرنے کی کوشش کی تو عوام ہم سے ناراض ہو گئے۔ اب آپ ہی کہیں کہ بیچارہ پولیس کا جوان اپنی ساری جوانی کے باوجود ان حالات میں کیا کر سکتا ہے؟ کرے تو مرے نہ کرے تو مرے۔

یہ ہماری زندگی کا ہر روز کا معمول ہے اکثر میرے دل میں یہ سوال ٹیس کے مانند اٹھتا ہے۔ آخر یہ سب کچھ کیوں؟ کب تک ہم غلط فہمیوں کا شکار اور دنیا کی پھٹکار کا نشانہ بنتے رہیں گے؟ دنیا ہم کو صرف وردی ہی وردی سمجھتی ہے۔ انسان کے روپ میں کیوں نہیں دیکھتی؟ لوگ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وردی کے اندر بھی ایک انسان ہے۔ جس کے سینے میں ایک دل ہے۔ دل میں وہی جذبات، امنگیں اور حسرتیں ہیں جو ہر ایک کے دل میں ہوتی ہیں۔ ہم بھی ہر ایک انسان کی طرح چاہتے ہیں کہ دنیا ہمیں اچھی طرح سمجھے۔ کیونکہ اس سمجھ کے بغیر باہمی اعتماد اور رفاقت پیدا نہیں ہو سکتی اور ان کے بغیر سکونِ دل اور راحت قلب کا حصول ناممکن ہے۔ جب جس کے لیے کام کیا جاتا ہے وہی نہ سمجھے تو قدرتی طور پر انسان کو اپنی زندگی اپنے کام پھیکے اور بے مزہ معلوم ہوتے ہیں ہر جگہ یہ مانی ہوئی بات ہے کہ کچھ مچھلیاں ایسی ہوتی ہیں جو سارے تالاب کو گندہ

کردیتی ہیں لیکن اگر پھر بھی آپ ہماری تکالیف اور مصائب کو پیش نظر رکھتے ہوئے سمجھنے کی کوشش کریں تو یقیناً ہم اپنی تمام خامیوں کو دور کر کے اور بھی زیادہ تن من سے آپ کی خدمت کر سکیں گے ورنہ اگر آپ کی بے پروائی کا یہی عالم رہا تو ہم یہ کہنے کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں ؎

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی تری عادت ہی سہی

اور تادم مرگ یہی حسرت ہمارے دل میں رہ جائے گی کہ آپ ہمیں سمجھ نہ سکے اور آخر وقت یہی کہہ کر سانس توڑیں گے ؎

مختصر ہے یہ ہماری داستانِ زندگی
اک سکونِ دل کی خاطر عمر بھر تڑپا کئے

ایک شریف کتّے کا خط انسان کے نام

بہت ہچکچاہٹ کے ساتھ میں یہ خط لکھ رہا ہوں۔ ویسے تو یہ بہت پہلے کا لکھا ہوا تھا لیکن اسے پبلک میں لانے سے ڈرتا تھا اور اب بھی سوچتا ہوں کہ آپ مذاق اڑائیں گے۔ اس بات کا یقین نہیں کریں گے کہ کتا بھی لکھ سکتا ہے۔ آپ کو یہ سن کر شاید کچھ تعجب ہوگا لیکن یہ حقیقت ہے کہ کافی تعداد میں کتّے لکھنا پڑھنا سیکھ چکے ہیں۔ کسی مناسب موقع پر ان کو بھی پبلک کے سامنے لایا جائے گا لیکن ابھی کچھ عرصے تک یہ تحریک انڈر گراؤنڈ ہی رہے گی۔ شاید میرے اس دلیرانہ اقدام کی پیروی کرتے ہوئے چند دوسرے کتّے بھی اپنی تحریریں منظرِ عام پر لانے کی ہمت کریں۔ بہرحال آج تو جو کچھ میں کہنے والا ہوں اس پر آپ چاہیں اعتبار کریں یا نہ کریں اور خواہ آپ برا ہی مانیں میں کہہ کر ہی چھوڑوں گا۔

میں اور میری برادری کے تمام کتّے جانتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے،

ارسطو نے کہا تھا کہ انسان سماجی جانور ہے۔ جانوروں اور انسانوں کے درمیان تفریق کی ایک بڑی وجہ انسان کی زبان ــــ یعنی طاقتِ گفتار ہے۔ آپ بول سکتے ہیں شور مچا سکتے ہیں، ایک دوسرے کو گالی گلوچ دے سکتے ہیں لیکن ہم جانور خاموشی سے انسان کی کرتوتوں کو دیکھتے رہتے ہیں۔ ویسے دیکھا جائے تو بولنے کی طاقت تو جانوروں کو بھی دی گئی ہے لیکن وہ صرف ایک قسم کی آواز ہی پیدا کر سکتے ہیں مثلاً مجھے خواہ کچھ بھی کہنا ہو "بھوں بھوں" کہہ کر ہی اظہارِ خیال کر سکتا ہوں۔ انسان سمجھتا ہے کہ میں کوئی کام کی بات نہیں کر سکتا۔ اس لیے میری باتوں کو لغویت اور بکواس سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ لیکن آپ شاید یہ نہیں جانتے کہ اس "بھوں بھوں" کے ردو بدل سے میں اپنا مطلب بیان کر سکتا ہوں۔ بالکل ویسے ہی جیسے تار کی گٹ گٹ سے تار لکھے جاتے ہیں۔ وہ بات جو آپ نے سالہا سال کی کاوش سے حاصل کی ہے، ہمیں روزِ ازل سے ہی ملی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ یہ بات بھی آپ نے کتوں سے سیکھی ہے تار کا موجد مورس MORSE کتوں کا بہت شوقین تھا اور اس نے بہت سے کتے پال رکھے تھے کئی سالوں کے لگاتار مشاہدے کے بعد اس نے کتوں کے اظہارِ خیال کے طریقوں کو اپنا لیا اور دنیا بھر میں ایک موجد کی حیثیت سے شہرت پائی۔ اس نے گو یہ راز کتوں ہی سے سیکھا تھا لیکن ان کی بے زبانی سے فائدہ اٹھا کر خود موجد بن بیٹھا۔ یہ ہمارے ساتھ انسان کی کی گئی لاتعداد بے انصافیوں میں سے ایک مثال ہے۔

میرا یہ خط لکھنے کا مقصد بھی یہی ہے کہ میں کتوں کی ذات سے متعلق کچھ ایسی باتوں پر روشنی ڈالوں جن کی بنا پر ملاوجہ ہماری خودداری پر حملے کئے جاتے ہیں اب وقت آگیا ہے کہ ہم کتے بھی اس ظلم و ستم کے خلاف آواز اٹھائیں۔ آج آپ کو ایک بولتے ہوئے (بلکہ لکھتے ہوئے) کتے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب کتے

بھی انسانوں کی طرح جلوس نکال کر، جلسے منعقد کر کے اپنے مطالبات منوا لیں گے۔ شاید بہت جلد ہی ہم آل انڈیا کتا کنونشن بلا سکیں گے اور یہ یقینی امر ہے کہ ہماری کنونشن بہت کامیاب ہوگی۔ کیوں کہ جہاں انسانوں کی زبان ہر ریاست میں جدا گانہ ہے وہاں ہم کتوں کی زبان تمام دنیا میں ایک ہے اور یہ بات ہمارے اتحاد کی ضامن ہے۔

شاید اب بھی آپ کو اعتبار نہیں آتا کہ یہ سب کچھ ایک کتا کہہ رہا ہے۔ بات دراصل یہ ہے کہ یہ کام مجھے میرے سابق مالک نے سرکس کے لیے سکھایا تھا۔ اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ اس کا دیا ہوا ہنر کسی دن اُسی کی صنف کے خلاف استعمال ہوگا۔ لیکن انقلاب ایسے ہی شروع ہوتے ہیں۔ خدا کرے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو تاکہ ہم کتوں کی تحریک نجات شروع کر سکیں۔

جناب ہم کتوں کو انسان کے خلاف بے انتہا شکایات ہیں شہری، پالتو اور آوارہ کتے سب اس شکایت میں متفق ہیں۔ لیکن میں یہاں صرف چند موٹی موٹی شکایتوں کا ہی ذکر کروں گا۔

اگر کوئی آدمی لالچی ہو، ذلیل ہو، کمینہ ہو اور ہر طرح سے ارزل الخلائق ہو تو اسے کتے کا خطاب مرحمت فرمایا جاتا ہے۔ میری غرض ہے کہ یہ ہماری ذات کے ساتھ کچھ زیادتی ہے۔ واقعات کی بنا پر یہ خطاب بالکل بے جا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انسان کا رتبہ خدا کی تمام مخلوق میں سب سے اونچا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ پس ماندہ جانوروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھے۔

اب آپ دیکھیے کہ ہزاروں سال سے انسان پیار اور محبت کا سبق پڑھ رہا ہے۔ خداوند تعالیٰ نے کئی پیغمبر اور اوتار اس پیام کی تبلیغ کے لیے بھیجے لیکن آج بھی انسان ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے بسوع مسیح، مہاتما بدھ،

حضرت محمدؐ اور مہاتما گاندھی ان سب لوگوں نے ایک ہی بات کہی لیکن ان اشرف المخلوقات کے کیا کہنے! آپ ہم کتوں کی مثال دیتے ہیں کہ جیسے ہم پھینکے ہوئے گوشت کے ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ جیسے ہم دودھ وغیرہ کے لیے چوری کرتے ہیں لیکن آپ نے اپنی طرف کبھی بھی توجہ نہیں دی لڑائیاں اور جنگیں — توپوں اور بموں کے ساتھ معمولی سی باتوں پر آپ ملک کے ملک تباہ کر دیتے ہیں۔ کتا کسی دوسرے کتے کا ماس نہیں کھاتا لیکن انسان تو اپنے بھائی کا بھی خون کر دیتا ہے۔ ہم اپنے شکار کو (سوائے مکھیوں اور چوہوں وغیرہ کے) خود جان سے نہیں مارتے لیکن آپ شہروں کے شہروں کا صفایا کر دیتے ہیں۔ آپ کے یہاں کی قسم اگر کتوں میں ایک بھی پیغمبر آیا ہوتا تو ہماری حالت کچھ کی کچھ ہوتی۔ ہمیں تو بغیر کسی لیڈر کے اپنا راستہ خود ہی ڈھونڈنا پڑتا ہے۔

عام طور پر آپ ایسے شخص جس کی جنسی بھوک حد سے تجاوز کر گئی ہو، کو بھی کتا ہی بنا دیتے ہیں۔ واقعہ تو یہ ہے کہ تمام حیوانوں اور انسانوں میں سب سے زیادہ شہوت پرست گدھا ہوتا ہے لیکن نہ جانے آپ کیوں اسے صرف بے وقوفی کے کنائے کے لیے ہی موزوں سمجھتے ہیں۔ ابھی پرسوں شام میم صاحب کا گدھا اور گدھی ہمارے ہاں آئے ہوئے تھے۔ باتوں باتوں میں یہ بات بھی نکل آئی۔ گدھی نے ہنستے ہوئے ہمیں بتایا کہ "میم صاحب" مانتے تو خود بھی اس بات کو ہیں کہ دنیا میں بیوقوفوں کا بادشاہ گدھا ہوتا ہے لیکن اپنے بچوں کو دودھ پلوانے کے لیے مجھے نہ جانے کتنی دور سے منگوایا ہے۔ اب بتایئے۔ کون بڑا بے وقوف ہے۔ انسان یا گدھا؟

اب سنیئے جنس کے بارے میں، یہ صحیح ہے کہ ہم کتوں میں کھلا میل جول ہوتا ہے۔ اور جنس کے معاملے میں کوئی مخصوص میاں بیوی نہیں ہوتے۔ لیکن اس بات کی تو آپ بھی تقلید کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جنس کے معاملے میں مشرقی آداب و سلیقے کی بجائے مغربی فیشن (جو ہمارے زیادہ قریب ہے) زور پکڑ رہا ہے اور جنسی آزادی

کی تحریک بہت ہر دلعزیز ہو رہی ہے۔ آخر یہ بھی تو بندھن ہی ہیں۔ انسان اب دھیرے دھیرے ان بندھنوں سے آزاد ہو رہا ہے اور کتے نے اپنی دوراندیشی سے پہلے ہی اس بندھن کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ آپ شاید بھول گئے ہیں کہ آپ کے سب سے بڑے فلسفی افلاطون نے بھی مشترکہ بیویوں کی سفارش کی تھی۔ قریب سو برس ہوئے انگلستان کے نارکسٹ ولیم گاڈون نے بھی انسان کو اس معاملے میں کتوں کی تقلید کرنے کی ہدایت کی تھی۔ اطمینان رکھیئے کوئی وقت آئے گا جب آپ بھی اس کامل آزادی کا مزہ چکھ لیں گے۔

کتوں کی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ کسی بھی کتے نے آج تک کسی غریب کتیا کی حرمت پر حملہ نہیں کیا۔ برخلاف اس کے آپ انسانی تاریخ کے صرف پچھلے چند برسوں پر نگاہ ڈالیے۔ تقسیم ہندوستان کے واقعات لیجئے، عورتوں پر کیا کیا نہ گزری۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ قانون سے مجبور ہو کر عورتوں کی عزت کرتے ہیں۔ ذرا قانون کی گرفت ڈھیلی ہوئی اور آپ نے "ذلیل کتوں" کی پیروی شروع کر دی۔ آپ کے چال چلن کا کوئی بھی تو ایسا درخشاں پہلو نہیں جسے آپ ہمارے مقابلے میں پیش کر سکیں۔ گدھے کی طرح کام کرنا، بھیڑیئے کی طرح خون کرنا۔ گیدڑ کی طرح بھبکیاں بتانا اور ڈرانا، لومڑی کی طرح چالاکی اور چاپلوسی سے اپنا کام چلانا" اونٹ کی طرح کینہ رکھنا، سانپ کی طرح موقع پاتے ہی ڈس لینا، بگلے کی طرح مچھلیوں کے انتظار میں بھگتی کرنا — دنیا سے حیوانات کی تمام برائیاں جمع کر دو اور اس مجموعی مجسمے کو نام دے دو انسان کا۔ بس یہی ہے نا ؟ کہاں ہے شیر کی بہادری اور دلیری، کہاں ہے چکور کی لگن ؛ کہاں ہے شاہین کی بلند پروازی اور کہاں ہے کتے کی وفاداری آپ میں ؟ آپ تو اشرف المخلوقات ٹھہرے نا ؟

آپ ہمیں لالچی کہتے ہیں تو بجا ہے۔ ہمیں ملتا ہی کیا ہے جو کبھی ہم سیری

محسوس کر سکتے ہیں پھر بھی اس باب میں ایک واقعہ سنیئے : بنگال کے قحط کے دنوں کا۔ ان دنوں میں بہت جوان تھا آج کل تو بڑھاپے کی نقاہت نے برا حال کر دیا ہے۔ ان دنوں تو میں زور بازو زیادہ زور دار تھا کر اسے سب کچھ کر سکتا تھا! کہتے ہیں تیس لاکھ انسان بھوک سے مر گئے۔ ایسی حالت میں ہمیں کون پوچھتا؟ ایک دن ایسا ہوا کہ جہاں میں پڑا ہوا تھا وہیں ایک آدمی بھی نڈھال پڑا ہوا تھا۔ ہم دونوں میں سے کسی میں چلنے کی ہمت نہیں تھی۔ بے بسی میں ہم ایک دوسرے کو تاکتے رہے۔ اس وقت میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ انسان کی آنکھوں میں برادرانہ جھلک دیکھی تھی۔ کتنا کم فرق تھا ہم دونوں میں اس وقت۔ کچھ نہیں بالکل کچھ نہیں! زبان کا بھی نہیں صرف شکل کا جیسے مختلف صورتوں کے دو ہم جنس بیٹھے ہوں۔ اتنے میں پاس سے گزرتے ہوئے کسی بیمار نے قے کردی۔ یقین مانیے ہم دونوں اس الٹی پر ٹوٹ پڑے اور لگے پیٹ کی آگ بجھانے۔ انسان اور کتا برادرانہ جذبے کی کتنی شاندار لیکن کتنی المناک مثال!! اشرف المخلوقات کی اس بے بسی پر میرے تین آنسو بہہ نکلے (دو آنسو دائیں آنکھ سے اور ایک آنسو بائیں آنکھ سے)

معیار زندگی کا مقابلہ کیجیے تو شاید کئی کتے انسانوں پر بازی لے جائیں۔ آپ کو راجاؤں، مہاراجوں اور نوابوں کے کتوں سے ملاقات کا موقع تو نہیں ملا ہوگا۔ شاید دور سے انھیں دیکھا ضرور ہو۔ میرے دو کزن (COUSIN) اور ایک "آنٹی" انگریزوں کے ساتھ رہے ہیں اور ایک دوست ایک مہاراجہ کے پاس اب بھی عیش کر رہے ہیں۔ وہاں انھیں وہ چیزیں مہیا ہوتی ہیں کہ عام انسان زبان چٹخارتا رہ جائے۔ وہاں ایک کتے کی خدمت کے لیے کئی انسان رکھے جاتے ہیں۔ اور مہاراجہ کے کتے نے ایک بار مجھے بتایا کہ کئی بار تو اس کی خدمت پر تعینات کیے ہوئے افراد اس کے راشن سے چیزیں چرا لیتے ہیں۔ انسان صرف ہمارے

بے زبان ہونے کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے ورنہ ......!

آپ میں سے کتنے انسان ہیں جنہوں نے کاروں میں سیر کی ہے یا اصلی گوشت کا مزہ چکھا ہے؟ ہم میں سے جو کتے امریکہ یا ولایت میں رہتے ہیں (یا ہندوستان میں بھی) وہ تو بس کاروں میں گھومتے ہیں، طرح طرح کے کھانے کھاتے ہیں اور کئی کتے تو کپڑے اور جوتے بھی خوب پہنتے ہیں۔

اصل میں صدہا سال سے انسان ہماری بے زبانی کا فائدہ اٹھا کر ہم پر ظلم کرتا رہا ہے۔ کتوں کو ذلیل، کمینہ، لالچی وغیرہ کہا گیا ہے۔ ہمارے محاسن پر کبھی کسی نے غور نہیں کیا۔

مثلاً وفاداری کو لیجیے۔ اس میدان میں بھی انسان کو ہم سے بہت سے سبق سیکھنے ہیں۔ تاریخ کے اوراق سیاہ دھبوں سے بھرے پڑے ہیں کیونکہ انسان وفادار نہ رہ سکا۔ نت نئے مالک بدلے جاتے ہیں اور پھر ان سے غداری کی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کتے میں کتنی وفاداری اور بردباری ہے۔ اپنی جان پر کھیل جائے گا پر مالک کو دغا نہ دے گا۔ سچا عاشق اصل میں کتے کی وفاداری کی ہی نقل کرتا ہے۔ سچ مانیے کی یہ خوبی جو انسان حاصل کر لیتا ہے، امر ہو جاتا ہے۔

عام طور پر ایک غلط فہمی انسان میں پائی جاتی ہے۔ یہ سمجھا جاتا ہے کہ کتا غلیظ جانور ہے۔ اس کا جواب اب میں صرف ایک چھوٹی سی کہانی سے دوں گا۔ ابھی پچھلے ہفتے کی ہی بات ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کے احاطے میں دوپہر کو سستا رہا تھا۔ اتنے میں ان کا ایک بھتیجا آیا اور کرسی جما کر وہاں بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر صاحب کسی طرح اس کو منع کرنا چاہتے تھے لیکن گول مول طریقے سے۔ وہ آئے۔ وہ اس لڑکے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے قدرے درشتی سے بولے "تم نے کبھی کتا دیکھا ہے کتا؟" وہ لڑکا میری طرف دیکھ کر بولا "جی ہاں دیکھ رہا ہوں" تو وہ بھی کہیں بیٹھتا ہے تو

سے جگہ صاف کر کے بیٹھتا ہے۔ تم ویسے بیٹھ تو روز ہی جاتے ہو، لیکن کبھی صاف بھی کیا ہے اس جگہ کو۔"

میں نے دوبارہ جان بوجھ کر زور سے دُم ہلا دی اور انسان کے اس غیر شعوری اعترافِ کمتری پر مسکرا دیا۔ وہ بے چارہ لڑکا میرے اشارے کو پہچان گیا اور اٹھ کر چلا گیا۔

متحد ہونا بڑے کاموں کے لیے بہت ضروری ہے پھر بھی کتوں سے زیادہ اتحاد اور برادرانہ پن انسانوں میں ملے گا؟ ایک کتا بولا (یعنی بھونکا) اور سب اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

ایک دن کالج سے آتے ہوئے دو لڑکے آپس میں بحث کرنے لگے۔ میں نے ابھی ابھی حلوائی کی دکان کی پلی ہوئی تازہ تازہ کچھ مکھیاں نگلی تھیں، موضوع میں اتنی دلچسپی کے سبب میں بھی ان کے پیچھے ہو لیا ان میں سے ایک بولا:

"تم کہتے ہو انسان اور حیوان میں کلچر کا فرق ہے کیا خوب آج کا انسان کیا کلچر رکھتا ہے۔"

"فنونِ لطیفہ...... یعنی فائن آرٹس" بات کاٹتے ہوئے دوسرا بولا۔

"ہوں" پہلے نے طنزیہ لہجے میں کہا "مثلاً سنگیت کو ہی لے لو — انسان سے کتے کا احساس موسیقی بہتر اور بلند ہوتا ہے۔ دیکھا نہیں تم نے "ہز ماسٹرس وائس" کے ریکارڈوں پر کس انہماک سے سن رہا ہوتا ہے کتا؟ ارے تم تو دس جنموں تک یہ احساس پیدا نہ کر سکو گے۔"

اس بے چارے کا جو حال ہوا سے تو بس جانے دیجئے۔ مجھے اتنی ہنسی آئی اس بات پر کہ اپنا قہقہہ بھونکنے کی صورت میں تبدیل کرنا پڑا۔

مختصر یہ کہ کتا اپنے گوناگوں اوصاف کی وجہ سے لاجواب جانور ہے اور انسان

ے کسی لحاظ سے بھی کم نہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ ہمیں اچھی طرح پہچانا نہیں گیا۔ ہماری خوبیوں کا اعتراف اس بات میں بھی ہے کہ جیسے سکھوں کے پانچ کاف ہوتے ہیں (کنگھی، کچھا، کیس، کڑا، کرپان) ویسے ہی افسروں اور امیر لوگوں کے بھی پانچ کاف ہوتے ہیں یہ (کتا، کار، کوٹھی، کلب اور کنڈر گارٹن) اور ان کاف میں کتے کو امتیازی حیثیت حاصل ہے اور کیوں نہ ہو۔ ایسی بے لوث محبت، وفاداری، لگن اور جلتی ہوئی ذمہ داری کی مثال آپ کو اور کہاں ملے گی۔

اچھا صاحب دیکھئے اب میں اجازت چاہتا ہوں۔ باہر کچھ دوست بھونک رہے ہیں اور مجھے بھی ان کی آواز میں آواز ملانی ہے۔ اس کے علاوہ میرے مالک کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ دیکھئے میری دم خود بخود ہل رہی ہے۔ یہ نشانی ہے اس بات کی کہ وہ بس آ رہے ہیں۔ بیشتر اس کے کہ وہ مجھے اس خط کو لکھتے ہوئے دیکھ لیں مجھے باہر نکل جانا چاہیے۔

مجھے امید ہے کہ اس خط کو پڑھنے والے انسان برا نہیں مانیں گے۔ جہاں تک ایک گھریلو کتے سے توقع کی جا سکتی ہے ادب و آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے میں نے اپنی پوزیشن واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دنیا بہت لمبی چوڑی ہے۔ اس میں طرح طرح کے جاندار پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم چاہیں تو خدا کی مخلوق سے کئی طرح کے سبق سیکھ سکتے ہیں۔ شاید کوئی انسان اس ناچیز کے دموں پہ چلنے والے لیکن شریف کتے کی صاف گوئی سے کچھ فائدہ اٹھا سکے۔ اچھا اب بھول کہوں — موقع ملا تو پھر لکھوں گا۔ فقط

"موتی کتا"

بہت کیسے دکھ ہوئے

مدت سے تمنا تھی کہ بیرونی ممالک کی سیر کی جائے۔ بدقسمتی یا خوش قسمتی سے میری نوکری ہی ایسی تھی کہ بہت سے جاپانیوں اور دوسرے غیر ملکی لوگوں سے ملنے کے مواقع مجھے ملتے رہتے تھے۔ جتنی بار ایسے مواقع ملتے، میری خواہش اور بھی تیز ہوتی، تمنا جیسے کہ کہا جاتا ہے اور بھی جوان ہوتی۔

اور اسے خوش قسمتی کی خاص خوبی سمجھئے کہ جب ہمیں کہیں باہر جانے کا موقع ملا تو وہ گویا آخر واپس جانے کا موقع تھا۔ ایک سرکاری ڈیلیگیشن میں جو پاکستان جا رہا تھا میرا نام بھی شامل ہو گیا اور ہمیں پاسپورٹ وغیرہ بنوا کر فوراً تیار ہونے کو کہا گیا۔ پاکستان سے آئے ہمیں (۱۶) سال ہو گئے تھے اور وہاں جانے کا موقع ملنے پر خوشی صرف اس بات کی نہیں تھی کہ ہم بدلتے ہمارے ہیں بلکہ یہ کہ ہم ان جگہوں کو دیکھ سکیں گے جہاں ہمارے بچپن کے بہترین لمحات گزرے تھے۔ تمام املاک پیچھے چھوڑ کر غیر ملک کو جاتے وقت دوستوں سے وہاں کے کچھ لوگوں کے لیے حوالے اور

تعارفی خطوط لینا اچھا رہتا ہے۔ اس سے وہاں جو دن گزارے جاتے ہیں ان میں کچھ اپنائیت، یگانگت اور بے تکلفی کی فضا پیدا ہو جاتی ہے پھر باہر جانے پر ہندوستانی کھانے کو دل ترسنے لگتا ہے۔ اپنی زبان میں بات چیت کرنے کو دل چاہنے لگتا ہے اور ان حالات میں اگر کوئی نیم دوست قسم کے لوگ مل جائیں تو غیر ملکی سفر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اور پھر پاکستان تو ایسا ملک ہے جہاں بھوپال یو۔پی کے لوگوں کے بہت سے نزدیکی دوست ابھی زندہ ہیں۔ چنانچہ جب وہاں جانے کی بات پکی ہو گئی تو ہم نے چند دوستوں سے اس بارے میں ذکر کرکے جانے سے پہلے چار پانچ لوگوں کے نام خطوط حاصل کر لیے۔

میری بیوی کی ایک سہیلی ہے جو بہت ہی شوخ اور ذہین واقع ہوئی ہے اس کا ذوق بھی نہایت عمدہ ہے اور ہر وقت اسے کوئی نہ کوئی نیا مذاق سوجھتا رہتا ہے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ میں پاکستان جا رہا ہوں تو جھٹ فون اٹھا کر بولی "ارے آپ نے ہمیں بتایا ہی نہیں، ہمارے چند دوست احباب وہاں ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو ان کو خط لکھ دوں ــــ بس ایسی خاطر کریں گے کہ آپ ساری عمر ہمیں دعائیں دیں گے۔" پہلے میں نے سوچا ضرور کوئی شرارت سوجھی ہوگی لیکن پھر اس کے اصرار کرنے پر میں نے ہاں کر دی۔ اس نے مجھے ایک فون نمبر دیا اور کہا کہ جاتے ہی اس نمبر پر فون کر دینا پھر دیکھنا قدرت کے رنگ۔ میں نے باقی لوگوں کے ساتھ یہ نمبر بھی نوٹ کر لیا اور خطوط کا پلندہ اپنے بریف کیس میں رکھ لیا۔ پاکستان پہنچا تو جاتے ہی کانفرنس کے سلسلے میں مصروف ہو جانا پڑا۔ اور جب کانفرنس ختم ہوئی تو کاک ٹیل، ڈنر اور لنچ وغیرہ کی بھرمار اور کلچرل پروگراموں کا بھی تانتا۔ ہنگامہ رہتا ہے مختصر یہ کہ دن بھر کی مصروفیات کی وجہ سے بہت تھوڑا وقت ملتا تھا۔ میں نے دو تین لوگوں سے رابطہ پیدا کیا اور انھوں نے مجھے اگلے ہفتے کے لیے کسی نہ کسی چیز کے لیے مدعو کیا۔ پھر ان لوگوں کے ٹیلی فون نمبر

لیے تھے۔ انھیں فون کرنا چاہا تو پتہ چلا کہ ہماری ڈائری ندارد۔ شاید سامان پیک کرتے وقت ڈائری رکھنا بھول گئے۔ خیر اب ہو کیا سکتا تھا۔ بہت افسوس ہوا کہ جانے کس کس قسم کے لوگ تھے جن سے ملاقات کی توقع تھی اور اب تو بس انھیں لوگوں سے ملاقات پر اکتفا کرنا پڑے گا جن کو ہماری آمد کے متعلق خطوط لکھے جا چکے تھے۔

تیسرے دن جب کانفرنس کے بعد شام کو ہوٹل واپس آیا اور چائے پینے والا ہی تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ فون اٹھایا تو ساری تکان دور ہو گئی۔ ایک بڑی پیاری سی نسوانی آواز بول رہی تھی۔

"آپ مسٹر راہی ہیں؟"

"جی"

"ہندوستان سے تشریف لائے ہیں؟"

"جی"

"آپ ریحانہ کے دوست ہیں؟"

"جی ـــ" میں ذرا ہچکچایا ـــ یہ کون ہمارے گھر کا بھیدی نکل آیا۔

"انھوں نے آپ کو کوئی ٹیلی فون نمبر دیا تھا؟"

"جی"

"تو آپ ابھی تک ٹیلی فون کرنے کی زحمت نہ کر سکے؟"

میں اس بے باکانہ طرزِ گفتگو سے کچھ حیران اور کچھ اپنی کوتاہی پر کھسیانہ بھی ہوا۔ میں نے جواب دیا "بات دراصل یوں ہوئی کہ وہ نمبر کہیں ادھر اُدھر گم ہو گیا مجھے خود اس بات کا بہت افسوس رہا ہے۔ وہ آپ ہی کا نمبر تھا کیا؟"

"جی ہاں ـــ ہم تو انتظار ہی کرتے رہے کہ آپ فون کریں گے۔"

"میں بہت شرمندہ ہوں۔ اگر آج شام آپ کے پاس وقت ہو تو میں خود

حاضر ہو کر معافی مانگنا چاہوں گا۔"

دوسری طرف سے بڑی پیاری ہنسی کی آواز آئی۔ جیسے ریڈیو پر گھنگرو بجنے کی آواز آتی ہے۔" دیکھئے تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ اپنے کمرے میں ہی رہیئے میں خود تقریباً آدھ گھنٹے میں وہاں پہنچ جاؤں گی اور پھر وہیں بیٹھ کر پروگرام بنالیں گے۔"

"بہت خوب" میں نے کہا۔" میں آپ کا انتظار کروں گا۔" فون چھوڑ کر میں واپس صوفے پر آیا تو چائے پینے کی خواہش مٹ چکی تھی۔ دل میں وہی ہنسی گھنگروؤں کی طرح بج رہی تھی۔ کس بے تکلفانہ انداز میں بات چیت کی تھی اس نے۔ وہ کون تھی؟ لڑکی یا عورت؟ خوب صورت یا بد صورت؟ میری ایک ہابی یہ ہے کہ جب بھی کسی انجانے آدمی سے ٹیلی فون پر بات کرتا ہوں تو اس کی عمر اور شکل و صورت کا اندازہ لگانے کی کوشش کرتا ہوں پھر بعد میں اگر اس سے ملنے کا اتفاق ہو تو دیکھتا ہوں کہ میرے اندازے کہاں تک صحیح تھے۔ اس فن میں مجھے اتنی مہارت ہو گئی ہے کہ شاذ و نادر ہی میرا اندازہ غلط نکلتا ہے۔ اس اندازے کے اعتبار سے تو اس آواز کی مالکہ کو کوئی بیس برس کی خوب صورت دوشیزہ ہونا چاہیئے تھا۔ پتلی سی نازک لڑکی بھورے بال ۔۔۔ اور جو تصویر میرے تصور نے اس کی بنائی تھی وہ ایک انتہائی پریشان کن حد تک خوب صورت لڑکی تھی۔

اب اگر ایسی لڑکی آدھ گھنٹے کے بعد کسی کے کمرے میں آ رہی ہو تو اسے فوراً مناسب تیاری کرنا چاہیئے۔ ہوٹل کے کمرے میں مختصر سے سامان کے ساتھ سجاوٹ بھی کیا ہو سکتی ہے؟ میں نے جھٹ سوٹوں کو وارڈروب میں ٹانگ دیا۔ جوتوں کو ایک طرف قرینے سے جما دیا اور فائلوں کو ڈسک پر ٹھیک طرح سے رکھ دیا۔ اکیلے مرد کے کمرے کی سجاوٹ قرینے میں نہیں بے ترتیبی میں ہی ہوتی ہے۔ قرینہ نسوانی خوبی ہے بے ترتیبی خاص مذکر نسم کی صفت ہے۔ میرا تجربہ ہے کہ بے ترتیبی سے الٹ پلٹ پڑی ہوئی چیزوں کو دیکھ

کہ لڑکیوں کی نسوانیت ابھرتی ہے اور وہ سوچتی ہیں "بے چارہ اپنا خیال ہی نہیں رکھ سکتا ہے مدد کی ضرورت ہے، دیکھ بھال کی ضرورت ہے" اگر یہ خیال لڑکی کے دل میں پیدا ہو گیا تو سمجھو کہ تیر چل گیا لیکن چونکہ میں پہلے ہی خامہ زخم خوردہ تھا اس لیے میرا مدعا تیر چلانے کا نہیں تھا۔ لہذا میں نے کمرہ جہاں تک ممکن تھا قرینے سے سجا دیا۔ ہاں دو چار کتابیں جو میں ہمیشہ سفر میں ساتھ رکھتا ہوں وہ میں نے اس انداز الٹی سیدھی رکھ دیں گویا سب کو میں ایک ہی وقت میں پڑھ رہا تھا اس انداز سے لوگ بہت مرعوب ہو جاتے ہیں۔ خاص کر جب کتابیں مختلف قسم کے ناول نہ ہوں بلکہ ایک کوئی کلاسک قسم کا ناول ہو۔ ایک فلسفے کی کتاب ہو' ایک مضامین کا مجموعہ' ایک کسی گمنام قسم کے لیڈر کی سوانح عمری' ایک انٹیلکچول قسم کا میگزین۔ اگر ہو سکے تو ایک نظموں کی کتاب الٹی رکھی جا سکتی ہے۔ ایک میں پچاسویں اور ساٹھویں صفحے کے درمیان پنسل ٹھونسی جا سکتی ہے (لال پنسل بہتر ہوتی ہے) دو کتابیں آپس میں ایسے رکھی جا سکتی ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کے صفحہ نمبر کی یاددہانی کے لیے رکھی گئی ہوں۔ آج کل کی پڑھی لکھی لڑکیوں پر اس سٹنٹ کا بہت رعب پڑتا ہے اور اس طریقے سے بات چیت شروع کرنے کے لیے ایک موضوع بھی مل جاتا ہے۔ آپ گفتگو ایسے شروع کر سکتے ہیں۔

(تھوڑا سا ہنستے ہوئے) "کیا عجیب اتفاق کی بات ہے۔ میں یہ جہانگیری کا ناول پڑھ رہا تھا اس میں جو ہیروئن ہے وہ بالکل آپ جیسی (؟) لگتی ہے" ..... اور پھر کچھ سنجیدہ ہو کر کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھتے ہوئے) "زندگی میں کتنے حسین اتفاقات پیش آتے ہیں۔ جیسا کہ والٹیر نے کہا ہے کہ انسان کی تین چوتھائی زندگی حادثوں اور اتفاقات کی رہین منت ہے ..." (اور ذرا رک کے) "آپ نے والٹیر کا ناول (CANDIDE) تو پڑھا ہوگا ....." وغیرہ وغیرہ۔

لڑکی اگر انٹیلیکچول قسم کی ہو تو خود ہی کتابوں کی طرف دیکھ کر بات شروع کر دے گی — "اچھا تو آپ کو فلسفے کا شوق ہے۔"

یا

"یہ مصنف بہت اچھا لکھتا ہے۔"

اس بات پر آپ کہہ سکتے ہیں — ہاں لیکن مجھے ٹوڑلیسی زیادہ پسند ہے ٹڑلیسی ارجنٹائن کا مصنف ہے — اور آپ اس کے متعلق آپ کی جو مرضی ہو کہتے جائیں کیونکہ ٹڑلیسی اگر کسی زندہ انسان کا نام ہو تو الگ بات ہے۔ یہ تو بالکل فرضی نام ہے۔

خیر یہ تو بات دوسری طرف نکل گئی میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تجربے اور مشاہدے کی بنا پر میں نے اپنی کتابوں کو اچھی طرح سے رکھ دیا اور اپنے کپڑوں کو جھاڑ پونچھ کر اس بے نام حسینہ کا انتظار کرنے لگا۔

مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ وہ میرے تصور اور اندازے سے بھی زیادہ خوب صورت نکلی۔ بڑی تیز قدمی سے اندر داخل ہوئی اطمینان سے صوفے پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی "میرا نام گائتری ہے۔"

"گائتری" — میں نے چونک کر کہا — "یہ تو ہندوستانی نام ہے۔"

"ہاں ہاں۔ میں آپ کی طرح ہندوستانی ہوں۔ یوروپ اور دوسرے ملکوں کی سیر کر کے ہندوستان واپس جا رہی ہوں، کچھ دن ہوئے یہاں پہنچی تھی۔ یہاں دس دن اور رہوں گی اور پھر واپس۔ ہم کلکتہ میں رہتے ہیں۔ آپ نے جینانی ملز کا نام سنا ہوگا وہ ہماری ہی ہیں۔ ہماری سب فیملی بزنس میں ہے۔"

"آپ بھی بزنس کرتی ہیں؟" میں نے ذرا ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ "بزنس کرنے والی عورتوں سے مجھے ذرا گھبراہٹ ہوتی ہے۔"

"جی نہیں" وہ بولی "کام وام تو بابا کرتے ہیں۔ میں نے تو ابھی پڑھائی ختم کی ہے۔ کیمبرج سے ماڈرن گریجویٹ ہوں۔ اب کچھ عرصہ شانتی نکیتن میں پڑھنے کا خیال ہے۔"

یہ سب باتیں اس نے اس آسانی سے کہہ دیں جیسے ہم اپنے متعلق بتائیں کہ ہم نے میونسپل پرائمری اسکول میں پڑھا اور بعد میں گورنمنٹ اسکول سے میٹرک کیا اور اب کسی نوکری کی تلاش میں ہیں۔ ان سے میں اتنا مرعوب ہو گیا کہ مجھے اپنی حماقت پر غصہ آنے لگا کہ کیوں خواہ مخواہ میں نے ان کتابوں کو الٹ پلٹ کرنے کا فرسودہ سٹنٹ کیا۔ ایسی لڑکی تو اس بات کو صاف تاڑ جائے گی۔ میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ وہ کتابوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

"تو آپ کا مطالعہ بھی روایتی قسم کے مصنفوں کا ہے۔ البرٹ کامیو پڑھیے آپ اور دیکھیے کیا نئے "دستا" آپ کے سامنے کھلتے ہیں۔"

"البرٹ کامیو؟" ــــ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی ہاں ــــ فرنچ مصنف ہے۔ نوبل پرائز ونر۔ بے چارہ جوانی میں ہی چل بسا۔"

"تو اس کی کتابوں کے ترجمے ملتے ہیں؟"

"ملتے تو ہیں لیکن اصلی مزہ فرنچ میں ہی آتا ہے۔ آپ کو فرنچ تو آتی ہو گی؟"

"جی ــــ" میں گھبرا گیا ــــ ویسے تو میں ہر ایک کو یہی بتلاتا تھا کہ مجھے فرنچ آتی ہے لیکن واقعہ یہ تھا کہ دس سال ہوئے کالج میں جونیئر کورس لیا تھا اب اس شوخ کے سامنے سچ بولنے میں ہی خیریت نظر آئی۔

"بہت کم۔ بس سمجھیے بالکل نہیں۔"

اس نے جیسے میرا جواب ہی نہیں سنا۔ اپنی نازک کلائی پر چھوٹی سی گھڑی کو دیکھ کر بولی: "اب دیکھئے انٹیلیکچوئیل باتیں تو بعد میں بھی ہو سکتی ہیں چلیئے کچھ پروگرام بنائیے آپ شہر دیکھنا چاہتے ہوں گے۔ کچھ دلچسپ قسم کے لوگوں سے ملنا چاہیں گے۔ نائٹ کلب بھی یہاں بُری نہیں ہے۔ اچھا آج تو آپ چلئے۔ پہلے ایک پارٹی میں چلیں گے اور پھر پاپا کے دوست کے ہاں جہاں میں ٹھہری ہوئی ہوں، کھانا کھائیں گے؟"

"لیکن میں ایسے ہی کسی پارٹی میں کیسے جا سکتا ہوں؟" میں نے روایتی اعتراض کیا۔

"ان تکلفات کی کوئی ضرورت نہیں آپ کے دعوت نامے میرے پرس میں ہیں۔ چلیئے آئیے۔"

"کپڑے؟" میں نے اپنے کپڑوں کی طرف دیکھ کر اس سے پوچھا۔

"گرمی ہے۔ کوٹ بے شک اتار دیجئے۔ یہاں سب انفارمل کام ہے۔" میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ وہ کار خود چلا رہی تھی۔ راستے میں مجھ سے میرے متعلق سوال پوچھتی رہی اور گاہے گاہے مختلف عمارتوں کے متعلق بتاتی رہی۔ "یہ رائٹرز بلڈنگ ہے، یہ اسٹیٹ بینک ہے وغیرہ وغیرہ" اس کا انداز اتنا بے تکلف اور پیارا تھا کہ میں دل ہی دل میں دعا کر رہا تھا کہ سفر جتنی دیر سے کٹے اتنا ہی اچھا ہوگا۔

شام کی پارٹی بہت ہی مزیدار رہی۔ مختلف قسم کے لوگ آئے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے چند لوگوں سے متعارف کرایا اور خود اِدھر اُدھر کے لوگوں سے باتیں کرتی رہی۔ اس کے پاس نہ ہونے سے مجھے کچھ آزادی اور خود اعتمادی کا احساس ہوتا تھا۔ جو اس کی موجودگی میں تقریباً غائب رہتا۔ پھر بھی مجھے ایسا لگتا تھا کہ وہ مجھے وقتاً فوقتاً دیکھتی رہتی ہے۔ جیسے ماں اپنی جوان لڑکی کو دیکھتی ہے کہ وہ سوسائٹی میں کیسے آگے بڑھ رہی ہے۔

اس کے بعد ہم کھانے کے لیے ان کے گھر پہنچے۔ گھر میں ایک قدیم وضع کے بوڑھے صاحب، ایک اُن کی بیوی اور دو لڑکیاں تھیں۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ گھر کے باقی ماندہ لوگ ہیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی شادی کر چکے ہیں۔ ایک چھوٹا لڑکا آکسفورڈ میں پڑھ رہا ہے اور یہ دو بچیاں ابھی یہیں زیرِ تعلیم ہیں۔ خلافِ توقع کھانے کے دوران میں کافی ہنسی مذاق چلتا رہا اور پھر کھانے کے بعد وہ مجھے ہوٹل تک چھوڑنے آئی۔ میں جب کار سے اتر رہا تھا تو وہ بولی ــ "آپ کو شطرنج کا شوق ہے؟"

"کچھ کھیل لیتا ہوں ــ" میں نے انکساری سے کہا حالانکہ میری بیوی میری شدتِ شوق سے نالاں ہے۔

- تو کل ساڑھے پانچ بجے انتظار کیجئے۔ میں آپ کے ساتھ چائے پیوں گی اور پھر شطرنج کھیلنے چلیں گے۔"

اگلے دن ہم نے کلب میں خوب شطرنج کھیلی۔

شطرنج شاید دنیا کا سب سے زیادہ سست اور دماغی کھیل ہے۔ چار پانچ بازیاں ہی کھیلی ہوں گی لیکن وقت ایسے گزر گیا کہ کھانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ہم ایک ریسٹوران میں چلے آئے اور کھانا کھانے کے بعد ہم نے دیر تک ڈانس کیا اور پھر کافی رات گئے اس نے مجھے واپس ہوٹل میں چھوڑ دیا۔

کانفرنس ایک ہفتے کے لیے تھی اور اس طرح ہمارے چار دن نکل گئے۔ ہر شام کوئی نہ کوئی پروگرام رہتا۔ حالانکہ کانفرنس والوں کی طرف سے بھی بہت سے پروگرام ترتیب دئیے گئے تھے لیکن اتنے بڑے مجمع میں ایک ڈیلی گیٹ کی غیر حاضری کی کسے خبر ہوتی ہے۔ جہاں تک کانفرنس کا تعلق تھا اس میں میری حاضری ٹھیک رہتی لیکن سوشل پروگراموں میں حاضری تو اتنی ضروری نہیں ہوتی۔

اس طرح گائتری کی حسین صحبت میں میں نے شہر کے سب حلقے دیکھ لیے۔ کلبوں، پارٹیوں اور دوسری مخصوص نشستوں میں بھی شرکت کی۔ یہ سفر ایک خواب جیسا تھا اور دل چاہتا تھا کہ یہ خواب کبھی ختم نہ ہو!

لیکن ہر چیز کبھی نہ کبھی اختتام کو پہنچتی ہے۔ کانفرنس ختم ہوئی۔ اس سے اگلے دن ہمیں اپنے اپنے گھروں کو جانا تھا۔ میں نے گائتری سے کہا کہ شام کو وہ مجھے کچھ شاپنگ میں مدد دے اور پھر بعد میں ہم دونوں کسی خاص ریسٹوران میں کھانا کھانے کا پروگرام تھا۔

شام کو جب وہ آئی تو اس نے بہت خوب صورت ساڑی پہن رکھی تھی وہ بالکل ایک آسمانی حور جیسی لگ رہی تھی (ویسے میں نے ابھی تک حور دیکھی نہیں)

"بولیے! کیا خریدنا ہے آپ کو؟" اس نے اپنے مخصوص شوخ انداز میں پوچھا۔

"بس بچوں کے لیے کچھ کھلونے ....."

"کھلونے؟" اس نے میری بات کاٹ کر پوچھا۔

معلوم ہوتا تھا وہ کچھ بوکھلا سی گئی تھی "کون سے بچوں کے لیے؟"

"جی میں ایک جائنٹ فیملی میں رہتا ہوں۔ دس بارہ بچوں کے لیے کھلونے لے جانے پڑیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ اور ہم نے کھلونوں کی دوکان سے بہت سارے جاپانی کھلونے خرید لے۔

"اب؟" اس نے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اب ذرا بازو والی دوکان میں چلتے ہیں، کچھ کپڑے خریدیں گے۔"

اندر پہنچ کر میں نے پوچھا: "یہاں ساڑیاں تو اچھی ملتی ہوں گی؟"

"ایسی ہی ہیں" اس نے کندھا ہلاتے ہوئے کہا۔

"کس کے لیے چاہئیں ساڑیاں آپ کو؟"

"بھابی کے لیے۔"

"اور ——" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"اور —— بیگم کے لیے" —— میں نے جواب دیا۔

گائتری کے چہرے کا رنگ ایک دم اڑ گیا۔ مسکراہٹ کی جگہ پریشانی نے لے لی۔ اس نے الماری کا سہارا نہ لیا ہوتا تو شاید گر ہی پڑتی میں نے اسے پکڑ کر کرسی پر بٹھایا اور پوچھا "کیوں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ نہیں ——" اس نے اپنی نحیف سی آواز میں جواب دیا۔

"ذرا چکر آ گیا تھا —— مجھے معاف کیجیے میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"ہاں چلو میں تمہیں چھوڑ آتا ہوں۔"

"نہیں، شکریہ —— میں بالکل ٹھیک ہوں، میں خود ہی چلی جاؤں گی۔"

میں نے اصرار کیا "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ شاپنگ جائے بھاڑ میں، میں آپ کو گھر تک پہنچا آؤں گا۔"

اس نے زیادہ انکار نہ کیا۔ راستہ میں اس نے کوئی بات نہیں کی بس ایک دو بار کوئی بات چھیڑنی چاہی لیکن اس کے منہ سے ہوں، ہاں کے سوائے کچھ نہ نکلا۔ دو تین بار میں نے پوچھا بھی کہ کیا بات ہے لیکن اس نے کچھ نہیں کہہ کر ٹال دیا۔ میں نے کہا ضرور کوئی ایسی بات ہو گئی جس سے اسے ایک دم دھکا سا لگا ہے لیکن اس نے اپنی پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بات ٹال دی۔

آخر ہم گھر پہنچے تو بجائے اندر آنے کے لیے کہنے کے اس نے گیٹ پر ہی کہا "شکریہ، آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ اب ڈرائیور آپ کو چھوڑ آئے گا۔"

گائتری کے اس روکھے پن سے مجھے بہت دکھ ہوا۔ اس نے کہہ رکھا تھا کہ وہ ایئر پورٹ پر بھی آئے گی۔ میں نے واپس مڑتے ہوئے کہا ــ" آپ کو ضرور کچھ ہو گیا ہے۔ کچھ آرام کرنے سے ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گی۔ اچھا پھر کل ملاقات کی توقع رکھوں ؟"

" میرا خیال ہے شاید میں نہ آسکوں، مجھے امید ہے کہ آپ بُرا نہیں مانیں گے۔" اس نے ایک عجیب پھیکے پن سے کہا۔

میں نے آخری بار کوشش کر کے پوچھنا چاہا ــ" کیا میری وجہ سے آپ کو کچھ تکلیف ہوئی ہے ؟"

" جی نہیں۔ یہ میری قسمت کی بات ہے۔ یقین مانیے مجھے آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے" اس کے انداز میں اتنی قطعیت تھی کہ مجھے ایسا لگا کہ اب وہ مجھ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی تھی۔

میں واپس آگیا۔ میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ میں نے کونسی ایسی بات کہی تھی جس سے اس کی طبیعت یوں اچانک خراب ہو گئی۔ پھر سوچا شاید کوئی اعصابی دورہ ہو۔ بہرحال اپنی اس چند روزہ دوستی کا ایسا اچانک اور ناخوشگوار انجام یقیناً میرے لیے باعث رنج تھا۔

اگلے دن جب میں پیکنگ کر کے ہوٹل کا بل دے رہا تھا تو پورٹر میرے پاس ایک لفافہ لایا۔ لفافے کو چاک کیا تو ایک چھوٹا سا خط تھا۔ رنجانہ کا لکھا ہوا۔

" پیاری گائتری !

اس بار نہ بچو گی، ایسا قاتل ہے کہ تم اپنی قسمت پر رشک کرو گی اور مجھے دعائیں دو گی۔ دیکھنا ذرا سنبھل کے قدم رکھنا ہندوستان آنے سے پہلے ہی فیصلہ کر لینا اکیلا ہے۔ نہ بھی پسند آئے تو میری خاطر خاطر خواہ تواضع کر دینا۔ ایک ہفتے میں پرکھ

سکتی ہو۔ کم بخت کو فون نمبر دے دیا ہے یہ بڑا عجیب قسم کا جانور ہے۔ دو دن تک فون نہ آئے تو خود ہی ملا لینا ــــ

میٹروہوٹل میں ٹھہرے گا۔ ۲۰ ر تاریخ ہے۔ امید ہے اس بار ہار جاؤ گی۔

پیار کے ساتھ

ریحانہ"

اور اس کے نیچے کسی دوسرے ہاتھ کی لکھی ہوئی یہ سطور:

"آپ سمجھ گئے ہوں گے میری طبیعت کے اچانک خراب ہو جانے کی وجہ۔ ریحانہ نے آپ کی بیگم کا ذکر نہیں کیا تھا۔ میں جب آپ سے ملی تو میں نے سوچا اب میرا اکیلا پن ختم ہو جائے گا اور میں نئی زندگی شروع کروں گی۔ ریحانہ نے بہت مذاق کئے ہیں میرے ساتھ لیکن یہ مذاق تو قسمت کا دھوکہ تھا۔ افسوس ہم اس طرح جدا ہوئے۔ کاش ہماری ملاقات ہی نہ ہوئی ہوتی!"

میں ریحانہ کے ایسے مذاق پہ دنگ رہ گیا۔ شاید اسی لیے اس نے کہا تھا کہ ایسی خاطر ہو گی کہ زندگی بھر دعائیں دو گے۔ میں تو شاید اسے اس چار دن کی چاندنی کے لیے دعائیں دوں گا لیکن میں سوچ رہا تھا بے چاری گائنتری کے متعلق ــــ کیا وہ اب اسے کبھی بھی دعائیں دے سکے گی؟ ــــ

حجّام کی دوکان

حجام کی دوکان شاید تہذیب کی سب سے پہلی نشانی تھی جب انسان نے وحشی زمانے سے مہذب زمانے میں قدم رکھا تو راستے میں وہ حجام کی دوکان سے ہی ہو کر آیا تھا۔ اسکول کے استاد اپنے پیشے کو سب سے پرانا سمجھتے ہیں۔ کچھ اور لوگوں کے خیال کے مطابق بیسوا کا پیشہ اس سے قدیم ہے اور دنیا کے ہر ملک میں اس کی ضرورت تسلیم کی جاتی ہے، لیکن حجام کا پیشہ اتنا پرانا اور اہم ہے کہ کسی نے بھی اس کے متعلق بحث کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کی اہمیت اتنی مسلّم ہے کہ ایمرجنسی میں اس کا نام ESSENTIAL SERVICES کی فہرست میں لکھنا بھی فضول سمجھا جاتا ہے۔

حجام اور اس سے متعلق کتنے ہی محاورے ہمارے روزمرہ میں شامل ہیں۔ ہر زبان میں اس کے متعلق کہانیاں اور کہاوتیں موجود ہیں۔ ایک ہفتہ، دس دن، پندرہ دن! اور اگر آپ بڑے ہی ڈھیٹ قسم کے آدمی ہیں تو زیادہ سے زیادہ ایک مہینے کے بعد آپ کو غالب کے دیدۂ تر کی طرح حجام کا اُسترا یاد آ جاتا ہے۔ اور آپ کو بھی کوچۂ حجّامان کا چکر لگانا پڑتا ہے۔

حجام کے پاس آدمی دو حاجتیں لے کر جاتے ہیں۔ بال کٹوائی اور شیو یعنی ڈاڑھی منڈوائی۔ حجام سے شیو کروانا تو قیاً لذیذ سی بات لگتی ہے اور آج کل زیادہ تر لوگ خود ہی شیو کرتے ہیں لیکن پھر بھی کلاسیکل طریقہ یہی ہے کہ آپ چٹائی پر بیٹھے ہوں اور حجام بندروں کی طرح بھُدک بھُدک کر آپ کی تھوڑی مونڈھے اور ساتھ ساتھ حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ بھی کرتا جائے۔ اب جب کہ مذہبی استروں کی درآمد بالکل بند ہوگئی ہے۔ ممکن ہے اکثر لوگ پھر سے شیو کروانے کا کام حجام کے ہی سپرد کردیں لیکن اس سے "حجام مارکٹ" پر زیادہ بوجھ پڑنے کا اندیشہ ہے اور خدشہ ہے کہ وہ اپنے دام بڑھادیں۔ خیر یہ تو ہر بزنس میں ہوتا ہی رہتا ہے۔

حجام کو عرفِ عام میں نائی بھی کہا جاتا ہے اور اکثر اسے راجہ کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ راجہ کہنا تو سراسر خوشامد ہے اور میرا خیال ہے یہ اس وقت سے شروع ہوا ہوگا جب کوئی ڈرپوک قسم کا آدمی کسی خونخوار قسم کے حجام کے پاس شیو کروانے پہنچ گیا ہوگا اور اس کے ہاتھ میں اُسترا دیکھ کر اس کے دیوتا کوچ کر گئے ہوں گے اور اس نے خوشامد کے طور پر حجام کو راجہ کے لقب سے نواز دیا ہوگا۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس، جس کے ہاتھ میں اُسترا وہ راجہ، جس کے ہاتھ میں تلوار وہ جبار راجہ!!

حجام اور نائی ایک ہی شخصیت کے دو مختلف پہلو ہیں۔ جب ہاتھ میں اُسترا، قینچی اور کنگھی لے کر وہ بالوں کے کاروبار میں جُتا ہو تو وہ حجام کہلاتا ہے۔ جب وہ اپنے کپڑے بدل کر سفید پوش بن کر کنیا کے لیے ور اور ور کے لیے کنیا ڈھونڈنے کا کام کرتا ہے تو وہ نائی کہلاتا ہے۔ تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ نائی نے جتنے رشتے بنائے اس سے زیادہ بگاڑے۔ نہ جانے رشتے بنانے اور بگاڑنے کا یہ نازک کام حجام کو کیسے مل گیا؟ لیکن یہ کچھ اچنبھے کی بات بھی نہیں۔ اگر حجام وحشی کو انسان بنا سکتا ہے تو کنوارے کو شادی شدہ کیوں نہیں بنا سکتا؟ شاید اس لیے یہ کام

اسے سونپا گیا کہ سیلون کھلنے سے پہلے حجام کی حیثیت سے وہ گھروں میں اکثر آتا جاتا رہتا تھا اور اپنے باتونی پن کی وجہ سے وہ خاندانوں کا رازداں بن گیا تھا۔ لہٰذا قدرتی طور پر وہ اس کام کے لیے چن لیا گیا ہوگا۔ شمالی ہند میں تو لوک گیتوں اور لوک کہانیوں میں نائی کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ وہ چاہے تو رشتے ٹوٹ سکتے ہیں۔ وہ چاہے تو دولہا اور دلہن کی آن بن ہو سکتی ہے۔ وہ ناراض ہو جائے تو برات در واز سے واپس چلی جائے۔ شمالی ہند کی تمام تر ازدواجی زندگی پر نائی کی شخصیت حاوی ہے اور اس کے وجود کا دیو پیکر سایہ پڑے بغیر وہاں کی زندگی کا کوئی کام انجام نہیں پا سکتا۔ خواہ وہ کام خوشی کا ہو یا غمی کا۔ وہ موقع منحوس ہو یا مبارک۔

اس کی شخصیت کا یہ پہلو وہاں کی سماجی زندگی کا ایک اہم پہلو ہے شمالی ہند کے گاؤں میں ابھی تک اس کا اثر اور وقار قائم ہے۔ البتہ شہروں میں چند پرانے خاندانوں کو چھوڑ کر اس کی ساکھ اب مٹ رہی ہے۔ وہاں وہ صرف حجام کی حیثیت سے ہی جانا جاتا ہے۔ لیکن شہروں میں اس کی حجامی شخصیت کی اتنی اہمیت ہے کہ آج کی شہری زندگی میں حجام کی دوکان، ہماری کھُرچی ہوئی تہذیب کی نشانی بن گئی ہے۔ کئی حجام چلتے پھرتے حجام ہوتے ہیں، فٹافٹ حجامت کرتے ہیں۔ دوسری اسٹیج یہ ہوتی ہے کہ فٹ پاتھ پر چٹائی بچھا کر دفتر کی طرف بھاگتے ہوئے بابوؤں کی حجامت بنائی جاتی ہے۔ لیکن ایک اچھی کامیاب حجام کی اپنی دوکان ہوتی ہے اور اکثر اس دوکان کو "سیلون" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ تحقیق ہے کہ یہ غیر ملکی لفظ صرف حجاموں کی مخصوص جائداد بن کر کیسے رہ گیا۔ یا تو اس کا استعمال ہیرس کے آرٹ اسٹوڈیوز کے لیے ہوتا ہے یا پھر ہمارے حجاموں کی دوکانوں کے لیے۔ بیچارہ فرانس!!

بعض جگہ حجام جراح کا کام بھی کرتے ہیں۔ کئی لوگ جب ان کے کسی انگ

میں درد ہو یا کوئی جوڑ ٹوٹ گیا ہو یا کہیں موچ آگئی ہو تو حجام کی دوکان کا رخ کرتے ہیں۔ یہ کام ہمارے پرانے سسٹم میں اتنا اہم سمجھا جاتا ہے کہ کئی حجاموں نے تو صرف جراح کے بورڈ لگوا رکھے ہیں اور ان کے یہاں حجامت کا کام صرف سائیڈ بزنس کے طور پر چلتا ہے اِس لحاظ سے ایک طرح کا ایکس آفشو (EX OFFICIO) سرجن بھی ہوتا ہے۔

حجام کی دوکان عام طور پر دوسری دوکانوں سے بہتر اور زیادہ آراستہ ہوتی ہے۔ اس کا ٹھاٹ باٹ اپنی بساط سے بڑھ کر ہوتا ہے۔ باہر سے شیشے کے دروازے ہوتے ہیں تاکہ گاہکوں کو اپنی طرف آسانی سے کھینچا جا سکے اندر بھی شیشوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ حجام کی دوکان میں بات کا بتنگڑ بنایا جاتا ہے، رائی کا پہاڑ بنایا جاتا ہے۔ آدمی کا ادھ منگڑ بنایا جاتا ہے۔ شیشے اس زاویے سے لگے ہوتے ہیں کہ آپ اپنے کو بے شمار پہلوؤں سے دیکھ سکتے ہیں۔ جب حجامت ختم کر کے حجام آپ کے پیچھے ایک اور آئینہ لے کر کھڑا ہوتا ہے تاکہ آپ ہر پہلو سے اپنے سر کو دیکھ سکیں تو آپ کی خوبصورتی کے کئی راز اسی لمحہ آپ پر اجاگر ہوتے ہیں۔

حجام کی دوکان پر ہر قسم کے لوگ جاتے ہیں۔ اس کے آگے ہر ایک سر جھکتا ہے۔ وہ بڑے سے بڑے آدمی کے کان کھینچتا ہے۔ اکثر لوگ اس کے آگے بیٹھ کر بغلیں بھی جھانکنے لگتے ہیں۔ اس کی دوکان پر تصویروں کی بھرمار ہوتی ہے۔ اس معاملے میں وہ بڑا آزاد خیال منش واقع ہوا ہے۔ رام، سیتا اور کرشن کی تصویروں سے لے کر مارلن منرو اور نوتن کی تصویریں ہر قسم کے پوزوں میں آپ کو دکھائی دیں گی۔ اشتہاری کیلنڈر ہر قسم کی اشیا کی تشہیر کرتے ہیں۔ حجام کو ننگی دیواروں سے سخت نفرت ہوتی ہے اور دیواروں کی عریانی وہ نیم عریاں ایکٹریسوں کی تصویروں سے چھپا دیتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ دیواروں پر سفیدی کرانے کی بجائے وہ ان کو

کیلنڈروں اور تصویروں سے ڈھانک دینا بہتر اور سستا سمجھتا ہے۔ اس کے علاوہ پروگریسیو قسم کی دوکانوں پر ایک دو اخبار اور ایک آدھ فلمی رسالہ اور کہیں کہیں ریڈیو سیٹ بھی رکھے ہوتے ہیں۔ اس سے ہر قسم کے انسان کو روحانی، دماغی اور فلمی خوراک ملتی ہے۔ انتظار کی گھڑیاں بھی آسانی سے گزر جاتی ہیں۔ یہ سب کاروبار بڑھانے کے ماڈرن طریقے ہیں، اور دوسرے پیشے کے لوگوں نے بھی حجاموں سے اس معاملے میں بہت کچھ سیکھا ہے اور بہت کچھ سیکھنا ہے۔ ابھی تک تاجروں نے صرف ایک بات ہی حجام سے سیکھی ہے اور وہ ہے گاہک کو مونڈنا۔

حجام کی دوکان ایک بہت اہم جمہوری ادارہ ہے، وہاں سب برابر ہوتے ہیں۔ اگر کبھی مسجد میں محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے تھے تو حجام کی دوکان کے کیو میں ڈائرکٹر اور رکشاراں ایک ہی بنچ پر بیٹھے دکھائی دے سکتے ہیں۔ بے روزگار نوجوان انٹرویو سے پہلے اپنی پرسنالٹی کو فائنل ٹچیز دینے کے لیے یہاں آتے ہیں۔ ٹھیکے دار اور تاجر ٹنڈر کھولے جانے سے پہلے یہیں اپنی ٹیپ ٹاپ سنواتے ہیں۔ اگر کبھی حجام خود ہی کیو سسٹم کی خلاف ورزی کرے تو سب لوگ ایک زبان ہو کر نعرے لگانا شروع کر دیتے ہیں اور کئی تو واک آوٹ بھی کر جاتے ہیں۔

پارلیمنٹ کے بعد حجام کی دوکان ہی ایسی جگہ ہے جہاں ہر موضوع پر سیر حاصل مباحثہ ہوتا ہے۔ بڑے سے بڑے شخص کی اس کی غیر حاضری میں حجامت کی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ حجام کا حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ جو صرف سیاسیات تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ زیادہ تر لوگوں کی ذاتی زندگی پر بھی وار کرتا ہے، اپنا جواب نہیں رکھتا ہے، اپنے محلے کے لوگوں کے متعلق اس کا تبصرہ تفصیلی اور چاشنی دار ہوتا ہے۔ کونسا ہونہار بیٹا اپنے والدین کو کیسے دھوکے میں رکھ رہا ہے؟ کونسی دیوی کس کے ساتھ بھاگ جانے والی ہے، کونسے سیٹھ صاحب کس طرح بلیک

مارکیٹ کرتے ہیں۔ مولوی صاحب مسجد جانے کے بہانے کہاں جاتے ہیں؟ یہ سب باتیں آپ کو حجام کی ہی دکان پر معلوم ہو سکتی ہیں۔ حجاموں کو بھی معلوم ہے کہ اسی کامنٹری کی وجہ سے ہی بیشتر لوگ ان کے پاس آتے ہیں۔ حال ہی میں ایک خبر آئی کہ ہسپانیہ کے ایک سیلون نے اشتہار دیا ہے کہ وہاں جو تین حجام کام کرتے ہیں اُن میں سے ایک عورتوں کے بارے میں، ایک قومی سیاست کے بارے میں اور ایک بین الاقوامی حالات کے بارے میں ایکسپرٹ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا کے حجام ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ پولیس کے پاس تو صرف مشتبہ کرداروں کی ڈائری ہوتی ہے لیکن حجام کے پاس اپنے علاقے کے سب لوگوں کے بارے میں اہم معلومات ہوتی ہیں اور اکثر سی، آئی، ڈی والے مجرموں کا سراغ لگانے میں حجاموں کی مدد لیتے ہیں۔ اب سنا گیا ہے کہ حکومت پولیس میں ایک حجام سکواڈ بنانے کے متعلق بھی غور کر رہی ہے تاکہ جرائم کی مؤثر روک تھام ہو سکے۔

حجام کی دوکان میں ہم سب کی جنم پتریاں بنائی اور پڑھی جاتی ہیں۔ وہاں ہم سب بنائے اور جلائے جاتے ہیں۔ وہاں انسان اور اس کی زندگی کے بارے میں سنگین پیشین گوئیاں کی جاتی ہیں حجام کا سیلون محلہ کا مقتل ہے۔ وہاں کی مسجد اور میخانہ، غریبوں کی روٹری کلب اور ان پڑھ لوگوں کا ریڈنگ روم۔ حجام کا سیلون محض ایک دوکان ہی نہیں بلکہ کسی بھی نظام میں ایک اہم سماجی ادارہ ہے۔ اس کے پاس ایسا کیمیائی جادو ہے کہ ایک بار تو حیوان کو بھی انسان بنا دیتا ہے۔ جو کوئی بھی اس ظالم کی دوکان پر ایک بار جاتا ہے وہ خود اپنی ذات کے ہی دامِ محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

الٰہی یہ دوکان ہے یا طلسمِ ہوشربا!

گھر کی رونق

بچپن میں ہماری ایک بہت بڑی خواہش تھی تو وہ یہ کہ گھر میں ریڈیو ہونا چاہیے۔ ان دنوں ریڈیو ابھی نیا نیا ہی رائج ہوا تھا اور امارت کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ یوں تو آج بھی ہندوستان میں ریڈیو ایک قسم کا STATUS SYMBAL یعنی آپ کی حیثیت کی سند ہے اور یہی وجہ ہے کہ آپ کسی بھی گھر میں چلے جائیں آپ کو ریڈیو ڈرائینگ روم میں، بیٹھک میں یا کسی ایسی ہی جگہ رکھا ملے گا۔ جہاں سے زیادہ سے زیادہ لوگ اُسے دیکھ سکیں۔ ویسے بھی ریڈیو کا ایریل ایسی چیز ہے جس سے دور سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ اس گھر میں ریڈیو ہے۔

اگر لوگ ریڈیو صرف نمائش کی غرض سے ہی خریدیں اور استعمال کریں تو ظاہر ہے کسی کو بھی اعتراض نہیں ہو سکتا۔ لیکن المناک بات تو یہ ہے کہ یہ آلہ صرف نمائش کے لیے ہی نہیں بلکہ خدا کی معصوم خلقت کی صبر آزمائی کے لیے کام میں لایا جاتا ہے۔ یہاں ایک قصہ یاد آگیا جو آپ میں سے اکثر حضرات نے سُنا یا پڑھا ہوگا۔

ایک دفعہ ایک آدمی نے بہت خوب صورت لیکن گونگی عورت سے شادی کی۔ شادی کے بعد اس نے حتی الوسع کوشش کی کہ کسی طرح اس کی بیوی کا گونگا پن دور ہو جائے۔ آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس کا اپریشن کیا گیا اور اس کی قوت گفتار واپس آگئی۔ گونگا پن دور ہوتے ہی اس نے اتنا بولنا شروع کر دیا کہ آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہی خاوند جس نے اتنی محنت سے اپنی بیوی کا گونگا پن دور کروایا تھا ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ یا تو اس کا گونگا پن واپس لاؤ یا مجھے بہرہ بنا دو۔

ریڈیو کے متعلق ہماری بچپن کی دیرینہ اور شدید خواہش کی تکمیل بھی کچھ ایسی ہی ہوئی۔ ریڈیو کیا آیا، گھر میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ویسے اگر صرف ریڈیو سننا مقصود ہو تو اسے خریدنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کا گھر کہیں بھی ہو چاروں طرف سے مختلف دوکانوں اور مکانوں سے مختلف اسٹیشنوں کے پروگرام کانوں پر حملہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر آپ بازار میں رہتے ہیں تو پھر تو واقعی آپ کا گھر انجیل والا بابل کا مینار TOWER OF BABEL کی مانند ہوتا ہے۔ خرید کر ریڈیو سننا تو دقیانوسی پن اور جہالت کی نشانی ہے۔ آپ مفت میں گھر میں بیٹھ کر ریڈیو سن سکتے ہیں بازار میں چلتے چلتے ریڈیو سن سکتے ہیں۔ ایک دوکان سے آواز بند ہوئی تو دوسری سے شروع ہو جاتی ہے۔ اس طرح آپ کا سفر بھی آسانی سے کٹتا ہے اور آپ شیلی کی طرح سُنی اور اَن سُنی دونوں قسم کی موسیقی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ پان والے اپنے بزنس کو فروغ دینے کے لیے سب سے پہلے اپنا سرمایہ ریڈیو پر ہی لگاتے ہیں۔ پہلے لوگ صرف خبریں یا کامنٹری سننے اکٹھے ہوتے ہیں، پھر آہستہ آہستہ پان اور بیڑی خریدنا شروع کر دیتے ہیں اور پھر یہ حالت ہو جاتی ہے کہ ان کو خود معلوم نہیں ہوتا کہ ان کا اصلی مقصد پان بیڑی خریدنا ہے یا ریڈیو سننا میرے اکثر دوستوں کو پان بیڑی کا چسکا ایسے ہی لگا۔ اس لیے ہمارے والد بزرگوار نے یہ سوچا کہ اولاد کو ایسے خراب

ہونے دینے کے بجائے یہی بہتر ہوگا کہ اس شیطانی آلے کو گھر ہی میں منگوا لیا جائے
یہ شاید والد صاحب کی دور اندیشی کا ہی نتیجہ ہے کہ ہم ابھی سگریٹ نوشی اور پان
جیوشی سے بچے ہوئے ہیں۔

ہماری دادی اماں مرحومہ (خدا ان کی روح کو بخشے وغیرہ وغیرہ) ریڈیو
کو شیطان کی ساس کہا کرتی تھیں۔ نہ جانے انھیں اس اچھی بھلی مذکر شئے میں کیا
چیز مونث نظر آئی۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ جب سے گھر میں ریڈیو آیا ہے مجھے ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ میں اب سارا دن انٹر کلاس کے لیڈیز کمپارٹمنٹ میں سفر
کر رہی ہوں۔ معلوم نہیں یہ ریڈیو والے کون ہوتے ہیں؟ کب سوتے ہیں؟ کب
جاگتے ہیں، کیا کھاتے ہیں، کیا پیتے ہیں؟ صبح ہمارے اٹھنے سے پہلے پروگرام چالو
ہوتا ہے اور جب سوتے وقت ریڈیو بند کرتے ہیں تب بھی کوئی بڑبولا قسم کا
شخص پروگرام یا پروگرام کا خلاصہ، خبریں یا خبروں کا خلاصہ، یا تبصرہ یا تبصرے
کا خلاصہ سنا رہا ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بات بھی کبھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ان لوگوں کا
مذہب کیا ہے۔ جنم اشٹمی ہو تو کرشن بھگتی کے گیت، محرم ہو تو نوحے، کرسمس ہو تو
عیسائیوں کے کیرل، ہر وقت ہر قسم کا پروگرام تیار رہتا ہے ان کے پاس۔ پھر سب
لوگ جانتے ہیں کہ رات دن میں ۲۴ گھنٹے ہوتے ہیں لیکن ریڈیو براڈکاسٹنگ ———
وقت ۳۶ سے بھی اوپر ہوتا ہے ان لوگوں نے وقت کو بھی ربڑ کی لچکدار بیٹی سمجھ
رکھا ہے، یا بچوں کی CHEWING GUM جس کو جتنا چاہا کھینچ کر بڑھا لیا۔
آدھی رات کے وقت بھی آپ کو امریکہ، افریقہ اور دوسرے ممالک کے پروگرام
سنائی دیں گے۔ یہ زمین گول ہونے کا ثبوت بھی ہے اور لعنت بھی کسی شاعر کا یہ کہنا
"جب سارا عالم سوتا ہے" غلط تھا۔ اس نے شاید ریڈیو نہیں سنا ہوگا۔ آپ
ریڈیو سن کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ سارا عالم ایک ہی وقت میں کبھی نہیں سوتا جیسے

ہندوستان میں خراٹے لے رہے ہوتے ہیں تو امریکہ میں موٹریں فراٹے بھر رہی ہوتی ہیں۔ جب وہاں کے انسان سونے کی تیاری کرتے ہیں تو ہماری بیل گاڑیوں کی چوں چوں سے ہماری صبح شروع ہوتی ہے۔ یہاں طلوع آفتاب ہوا تو وہاں نائٹ لائف کا آغاز گویا زندگی چلتی رہتی ہے۔ بزم چراغاں رہتی ہے محفل کبھی سونی نہیں ہوتی، پرانے زمانے کے شاعر کے مقابلے میں آج کا ریڈیو سننے والا شاعر بجا طور پر یہ کہتا ہے۔

جسے سمجھتے ہو رات اپنی وہ نصف دنیا کا روز روشن
جسے سمجھتے ہو دن کی محفل وہ نصف دنیا کی شب کا مدفن

ریڈیو پر کئی قسم کے پروگرام ہوتے ہیں۔ بچوں کا پروگرام، بڑوں کا پروگرام، بہنوں کا پروگرام، دیہاتیوں کا پروگرام، اسکولوں کا پروگرام، کالجوں کا پروگرام گویا ہر شخص کو اپنی قسم کا پروگرام مل ہی جاتا ہے۔ جس دن ہمیں کھانے کے لیے کوئی نئی ادھ کچی یا زیادہ جلی ہوئی چیز ملے تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ آج بیگم نے بہنوں کے پروگرام سے کوئی نیا پکوان سیکھا ہے اور جب بھی میں ڈاکٹر کے پاس پیٹ کے درد کی شکایت لے کر جاتا ہوں تو وہ مسکرا کر پوچھتا ہے "اس بار بھی بہنوں کا پروگرام راس نہیں آیا آپ کو؟"

اب تو میں نے ریڈیو والوں سے درخواست کی ہے کہ بہنوں کے پروگرام کے فوراً بعد بہنوئیوں کا پروگرام ہونا چاہیے جس میں پیٹ کی ان تمام بیماریوں کے علاج بتلائے جائیں جو بہنوں کے پروگرام میں بتائے گئے پکوانوں کو کھانے سے ہوتی ہیں۔ اس سے پروگرام کی افادیت بڑھ جائے گی۔

علاج کی بات چلی تو ایسے ریڈیو سسٹم یاد آتے ہیں جو پروگراموں کے ساتھ تجارتی اشتہار بھی سناتے ہیں لیکن سب سے زیادہ خطرناک بیماریوں اور ان کی دواؤں کے اشتہار ہوتے ہیں۔ صبح بستر سے اٹھ کر گلا صاف کرتے کے

یے کھنکارا ہی تھا کہ ریڈیو اناؤنسر چلاتا ہے — "کھانسی، ہوشیار رہیئے۔ یہ کھانسی دمہ کی نشانی ہے۔ آج ہی اپنے دوا فروش سے فلاں دوائی منگوائیے۔" اور شام وہ دوا ہمارے گھر پہنچ جاتی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ جلاب لینے سے ڈرتے تھے۔ آج کل بچے ہر روز جلاب لینا چاہتے ہیں تاکہ کھانے کو میٹھی گولیاں ملیں — اور اسکول سے چھٹی کا بہانہ ہاتھ لگ جائے۔ ہمارا یہ حال ہے کہ جوڑوں میں درد کی دوائی کا اشتہار سنا تو گھٹنوں میں ٹیسیں اٹھتی معلوم ہوتی ہیں۔ بلڈ پریشر کی تشریح سن کر نبض کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ دل کی کمزوری کا نام آیا تو ہماری سانس پھول جاتی ہے اور جان پڑتا ہے کہ آخر کار ہمیں اپنی بیماری کا پتہ لگ ہی گیا۔ زکام، نمونیہ کا پیش خیمہ معلوم ہوتا ہے اور زکام کے ختم ہونے کے بجائے ہم نمونیہ کی آمد کا انتظار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ دفتر میں معمولی تھکاوٹ کسی اور پوشیدہ قسم کی بیماری کی نشانی بن جاتی ہے۔ جگر کی بیماری کی دوا کا اشتہار سنا تو میر کے ساتھ چلائے کہ:

"سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے"

ریڈیو پر گانوں کے درمیان اشتہار اس عمدگی سے پیش کئے جاتے ہیں کہ غالب کے مشہور شعر کو اس ترمیم کے ساتھ پڑھنے کو دل چاہتا ہے ؎

دیکھنا تشہیر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ مرض مجھ کو بھی ہے

اب ہم ان اشتہاروں سے نفسیاتی طور پر اتنا متاثر ہو چکے ہیں کہ ہمیں یقین کامل ہو گیا ہے کہ دنیا کی تمام سنگین قسم کی بیماریوں کے جراثیم نے اس ننھی سی جان کو قابو کر لیا ہے اور وہ دن دور نہیں کہ ہم کسی دن راہ چلتے نقاہت کی وجہ سے گر پڑیں گے۔ اور — بس۔ رام نام ست۔ حیرانی تو اس معجزے پر ہے کہ ہم اتنے سال سے زندہ کیسے ہیں؟

گھر میں دواؤں کے انبار لگے ہوئے ہیں۔ کھانے سے پہلے کی دوا، نہانے کے بعد کی دوا، سوتے وقت کی دوا، اٹھتے وقت کی دوا، ہمارے لیے بھوک بڑھانے کی دوا، بیگم کے لیے بھوک مارنے کی دوا، روتے بچوں کو ہنسانے کی دوا، ہنستے بچوں کو چپ کرنے کی دوا۔ ہر وقت کے لیے ہر قسم کی دوائیں ہمارے پاس موجود ہیں اور جو کوئی بھی گھر آجائے اسے بھی چائے پانی کے لیے نہ پوچھیں تو نہ سہی لیکن یہ ضرور پوچھتے ہیں کہ آپ کونسی دوا کھائیں گے؟ موت کا تو اب ویسے ہی انتظار رہنے لگا ہے اس لیے ہم نے اپنی وصیت بھی تیار کروالی ہے اور اس میں لکھ دیا ہے کہ ہماری موت کے بعد ان تمام دواؤں سے ایک خیراتی ڈسپنسری کھول دی جائے جس کا نام ریڈیو ڈسپنسری ہو۔

جب سے ریڈیو ہمارے گھر بڑا جا ہے، پڑوسی کا پاس گیا، ہمسائیگی سے بے نیازی ہوگئی گھر میں بھی کسی سے کم ہی بات کی جاتی ہے۔ کوئی آئے، کوئی جائے، کوئی جیے یا مرے، ہم ہیں کہ ریڈیو کے پاس ایسے بیٹھے ہیں جیسے ولایتی گوند سے چپکائے گئے ہوں۔ وہ جو کسی نے کہا ہے ؎

"دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو"

وہ بات تو گئی۔ آج اگر کوئی دردِ دل ہے تو وہی جس کی دوائی کا اشتہار ریڈیو پر دیا جاتا ہے۔ جب ٹیلی ویژن آجائے گی تو نہ جانے کیا ہوگا۔

انسان ڈینگ مارتا ہے کہ حیوان پر اس کی فوقیت کی نشانی اس کی قوتِ گفتار ہے۔ اسی قوتِ گفتار کی بے لگامی نے ہم سے ریڈیو ایجاد کروایا۔ لیکن اب حیوان کی انسان پر فوقیت یہ ہے کہ اسے ریڈیو نہیں سننا پڑتا۔ انسان باہر کی دنیا سے تھک ہار کر گھر کا رخ کرتا ہے تاکہ جھنجھٹوں سے نکل کر کچھ سکون حاصل کرسکے لیکن گھر میں جب ریڈیو کی "جھنکار" اس کے کانوں میں پڑتی ہے تو اس پر یہ تلخ

حقیقت واضح ہوتی ہے کہ دنیا سے کوئی بچاؤ ممکن نہیں۔ دنیا کے جھگڑے، دنیا کا شور و غوغا، دنیا کی بیماریاں سب سمٹ کر ریڈیو میں آن بیٹھے ہیں اور ایلیٹ (ELLIOT) کے الفاظ میں "فرار کی کوئی جگہ نہیں"۔ زندگی کے شکنجوں نے ہمیں چاروں طرف سے کس لیا ہے۔ جب ایسے وقت میں انسان اپنی قسمت پر غور کر رہا ہوتا ہے تو ریڈیو اکثر یہ گانا سناتا ہے ؎

"جائیں تو جائیں کہاں؟"

اور اس وقت، اسی لمحہ یکدم انسان محسوس کرتا ہے کہ ریڈیو ہمارا دشمن نہیں دوست ہے۔ وہ ہماری بے چارگی کا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ ہمارے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہا ہے۔

میں ہوں

میرے نوکری نہ کرنے کی وجہ یہ نہیں تھی کہ مجھے کوئی نوکری مل نہ سکی۔ دراصل میں نے کبھی نوکری کی تلاش ہی نہیں کی۔ پڑھنے کا شوق تھا۔ ڈگریاں حاصل کرنے کا جنون تھا اور میری سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ سیاسیات پر کبھی دن ایسی معرکہ آرا کتاب لکھوں کہ افلاطون، ارسطو اور مارکس کے بعد بس وہی کتاب ہر یونیورسٹی میں پڑھائی جائے۔ یہ صرف نام پیدا کرنے کی خواہش ہی نہیں تھی بلکہ میں سمجھتا تھا کہ واقعی مجھے سیاسیات کی تھیوری میں کوئی خاص الخاص بات کہنی ہے۔ یونیورسٹی کے تمام امتحانوں میں میری پوزیشن بہت اچھی رہی۔ اور اس طرح مجھے وظیفے بھی ملتے رہے۔ ایم۔اے پاس کرنے کے بعد مجھے پی۔ایچ۔ڈی کے لئے دوسو روپے ماہانہ کا وظیفہ مل گیا۔ شروع میں عام نوکری میں بھی تقریباً اتنا ہی ملتا ہے اور پھر اس میں خود مختاری کے علاوہ اپنی خواہش اور مقصد کی تکمیل کا موقع بھی مل سکتا تھا۔ لہٰذا نوکری کرنے کا جو کچھ امکان تھا وہ بھی ختم ہو گیا۔ پی۔ایچ۔ڈی۔ کے

لیے وظیفہ مجھے لکھنؤ یونیورسٹی نے دیا تھا اس لیے میں وہیں منتقل ہو گیا۔ یونیورسٹی ہوسٹل میں ریسرچ اسکالروں کے لیے علیحدہ کمرے ہوتے ہیں انھیں میں سے ایک کمرہ مجھے بھی مل گیا۔

میں لائبریری میں آٹھ گھنٹے روز کام کرتا۔ دوست میرے بہت کم تھے۔ شام میں کچھ تفریح ہو جاتی۔ ہفتے عشرے میں کبھی کبھار ایک دو گھروں میں چلا جایا کرتا تھا۔ ان میں سے ایک میرے وائس چانسلر کا گھر تھا۔ دوسرا ایک ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ کا اور ایک کوئی اور گھر تھا۔ نہ جانے ان سے واقفیت کیسے ہو گئی لیکن دھیرے دھیرے وہاں بھی آنا جانا ہو گیا۔ میری سوشل زندگی ان گھروں تک ہی محدود تھی۔

مجھے ہندوستانی انقلاب پسند اور سیاسی مفکر ایم۔ این رائے کی تحریروں سے اور ان کے سیاسی طرزِ فکر سے بڑی دلچسپی تھی۔ جس دن وہ مرے، اسی دن میں نے ان کی فلاسفی پر ایک مضمون لکھا جو اگلے دن بیشتر اخباروں میں شائع ہوا۔ اس کے کچھ دن بعد ایک ایڈیٹر کی معرفت مجھے مسز رائے کا خط ملا جس میں انھوں نے میرے مضمون کی تعریف کی تھی اور کہا تھا کہ اگر میں ان سے کبھی دہرہ دون میں مل سکوں تو یقیناً دونوں مل کر ایک اچھی سی کتاب لکھیں گے۔ میں نے فوراً جواب دیا کہ جلد از جلد میں ان سے ملنے کی کوشش کروں گا۔ ابھی یہ میرا ریسرچ کا پہلا سال ہی تھا۔ اگلے مہینے میں ان سے ملنے گیا۔ مجھے اس گھر میں جا کر عجیب سا سکون ملا۔ مشرق اور مغرب کا عجیب سا سنگم۔ مسز رائے امریکن خاتون تھیں۔ گھر کتابوں سے اٹا پڑا تھا۔ پیانو اور ریڈیوگرام کے پاس بے شمار ریکارڈ، میگزین اور اخباروں کے بلندے دھرے تھے۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہی میرے گھر کی (اگر میرا گھر کبھی ہوا تو) تصویر ہوگی۔ میں وہاں ان کے مہمان کی حیثیت سے تین دن رہا۔ دوسرے دن شام کو انھوں نے

کچھ لوگوں کو کھانے پر بلایا۔ سب انٹیلکچویل (Intellectuals) قسم کے لوگ تھے۔ شام بڑی اچھی گزری۔ اس پارٹی میں تقریباً سبھی لوگ مجھے پسند آئے۔ کوئی کتابیں لکھ چکا تھا۔ کوئی لکھ رہا تھا، کوئی لکھنے والا تھا۔ بڑا انقلابی قسم کا گروپ تھا۔ ہر عمر اور ہر صوبے اور کچھ دوسرے ملکوں کے بھی لوگ وہاں تھے۔ اس گروپ میں ایک لڑکی سے میرا تعارف کروایا گیا۔ جو نہ تو کتابی کیڑا تھی اور نہ ہی مصنف۔ میں نے جب اس کی تعریف پوچھی تو وہ خود ہی کہنے لگی۔ میں اس گروپ میں اجنبی ہوں میرا شوق صرف سنگیت سے ہے۔ کام وام ابھی کچھ نہیں کرتی۔ ایک دو بار کچھ ڈرامے اور کنسرٹ کیے ہیں، پھر کچھ وقفے کے بعد خود ہی بولی "میں ہندوستان کی سب سے بڑی امیر لیسا ریو بننا چاہتی ہوں"۔ یہی اس گروپ کی خصوصیت تھی۔ یہاں سبھی لوگ ایسے تھے جو ہندوستان کے سب سے بڑے کچھ نہ کچھ بننا چاہتے تھے۔

میرے قیام کے آخری دن وہ ملنے آئی اور ہم کافی دیر تک ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے سنگیت کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ ہندوستانی موسیقی اور مغربی میوزک کا موازنہ کیا۔ اور بتایا کہ دونوں میں کتنی ہم آہنگی ہے اور اس طرح آرٹ کے بارے میں اس نے میرے ذہن میں کتنے ہی نئے پٹ کھول دیئے۔ وہ اگلے مہینے دہرہ دون میں ایک کنسرٹ کی تیاری کر رہی تھی۔ اور اس نے اصرار کیا کہ اس میں، میں بھی ضرور شرکت کروں۔ اور اگر ہوسکے تو کچھ دن پہلے ہی آجاؤں۔ مسز رائے نے بھی وعدہ لیا تھا کہ میں ان سے جلد ہی ملوں گا تاکہ کتاب کے بارے میں کچھ نہ کچھ جلدی ہی طے ہو جائے۔

اگلے دن میں دہرہ دون سے لکھنؤ واپس آگیا۔ میں محسوس کر رہا تھا کہ اس بار کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ بار بار دہرہ دون کا خیال آرہا تھا۔ لائبریری

میں آٹھ آٹھ گھنٹے کام کرنے کے بجائے زیادہ تر ادھر اُدھر ہی گھومتا رہا۔ اپنے دو تین شناساؤں کے گھروں میں بھی کم ہی جاتا۔ بس یوں ہی کسی طرح وقت کاٹنے کی فکر لگی رہتی۔

جوں توں کر کے مہینہ گزرا اور میں پھر بڑے اشتیاق سے دہرہ دون پہنچا اس بار میں ایک مہینے کے لیے گیا تھا۔ اس گروپ کی ایک دو پارٹیوں میں جانے کے علاوہ میں اِدھر اُدھر ہی گھومتا رہا۔ وہ لڑکی، جس کو ہم راکا ہی کہیں گے، مجھے سیر کے لیے لے جاتی۔ ایک دو بار وہ مجھے اپنے فلیٹ میں بھی لے گئی۔ وہاں ہم نے بہت سے ریکارڈ سنے۔ پھر کنسرٹ ہوئی جو نہایت ہی کامیاب رہی۔ کنسرٹ کے بعد وہ بہت ہی خوش تھی۔ اس کے کہنے پر ہم دونوں دو دن کے لیے مسوری بھی گئے۔ مسوری میں پہلے بھی دیکھ چکا تھا لیکن راکا کے ساتھ مسوری جانے میں کچھ اور ہی بات تھی۔ ہر جگہ، ہر چیز میں کچھ اور ہی لطف آنے لگا۔ ان دو دنوں میں ہم ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئے۔ اور میں نے بالکل ہی اپنے آپ کو کھو دیا۔ پھر وہ طلسم ٹوٹا اور مجھے واپس لکھنؤ آنا پڑا۔ لیکن اس وعدے کے ساتھ کہ میں جلد از جلد دہرہ دون آؤں گا۔

اور پھر میں جتنی بار ہو سکا، دہرہ دون جانے لگا۔ مہینے میں دو بار، کبھی تین بار۔ اور اکثر ٹھہرتا بھی میں کسی ہوٹل میں۔ مسز رائے اصرار کرتی تھیں کہ میں انھیں کے پاس رہوں لیکن میں محسوس کرتا تھا کہ جب میں کسی اور مقصد کے لیے جاتا ہوں تو مسز رائے کا مہمان بننا مناسب نہیں۔ ویسے مسز رائے کو بھی سب معلوم تھا۔ اور میں نے انھیں بتا بھی دیا تھا کہ اپنا تھیسس مکمل کرنے کے بعد ہی میں ان کے ساتھ کتاب لکھنے میں پورا تعاون کر سکوں گا۔

جب گرمیوں کی چھٹیوں میں یونیورسٹی بند ہوتی ہے تو ریسرچ اسکالرس، دو

ماہ کے لئے وہاں سے چلے جاتے ہیں۔ اس بار میں نے گھر لکھ دیا تھا کہ میں نہ آسکوں گا۔ کیوں کہ مجھے کچھ مواد اکٹھا کرنے کے لئے ڈیڑھ دو دن رہنا پڑے گا۔

اس بار جو میں ڈیڑھ دو دن آیا تو راکا کے گھر کے پاس ہی ایک ہوٹل میں کمرہ مل گیا۔ دراصل راکا نے ہی کوشش کر کے یہ کمرہ میرے لیے ریزرو کروایا تھا پھر جب بعد میں مسز رائے کچھ عرصے کے لیے امریکہ چلی گئیں تو ان کے اصرار پر میں انھیں کے گھر منتقل ہو گیا۔ ویسے بھی اس طرح مجھے کئی سہولتیں مل جاتی تھیں۔ اور پھر بچت بھی کافی ہو جاتی تھی۔ اسی طرح میرے وظیفے میں معقول گزارہ بھی ہو سکتا تھا۔

راکا اور میں ہر شام نہیں مل سکتے تھے۔ اس کی گوناگوں مصروفیات کی وجہ سے کبھی دو دو تین تین دن کے ناغے بھی پڑ جاتے تھے۔ کبھی ملاقات کی جگہ اور وقت مقرر کرنے کے بعد اس کا فون آجاتا کہ اس کا آنا ممکن نہیں ہوگا۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی اس کا اعتراف لفظی طور پر تو نہ کبھی اس نے کیا تھا اور نہ میں نے۔ لیکن ہم دونوں بخوبی جانتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہیں۔ مجھے اکثر تعجب ضرور ہوتا تھا کہ اتنی محبت کے باوجود وہ کئی بار ہماری ملاقاتیں کینسل کر دیتی ہے میں نے سُن رکھا تھا کہ لڑکیاں محبت میں سب کچھ بھلا دیتی ہیں۔ لیکن راکا پر اس قول کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنے کام میں اتنی ہی منہمک تھی جتنی کہ پہلے۔ اور اپنے پرانے حلقۂ احباب کو بھی اس نے ابھی برقرار رکھا تھا۔ میرا یہ مطلب نہیں کہ مجھے کبھی بھی یہ خیال آیا تھا کہ مجھ سے راکا کی محبت مکمل یا پُر خلوص نہیں تھی لیکن پھر بھی مجھے اس پر تعجب ضرور ہوتا تھا اور جتنا میں اسے سمجھنے میں ناکام رہتا اتنا ہی میرا جذبہ شدید ہو جاتا لیکن مجھے معلوم تھا کہ اسے کسی اور سے لگاؤ نہیں اس لیے جب وہ دوسرے لوگوں سے

ملتی بھی تو مجھے حسد بالکل نہیں ہوتا تھا۔

ان دو مہینوں میں ہم اکثر گھنٹوں تنہائی میں رہے۔ میرے قیام کے آخری دنوں میں میں نے ایک اور بات محسوس کی۔ ہماری تنہائی کے ان پُر کیف لمحوں میں وہ اکثر اچانک کسی نہ کسی بات پر اُلجھ جاتی اور مجھ سے ناراض ہو جاتی اور پھر کچھ دیر کے بعد پوچھتی ——— "تمہیں کب پیار کرنا آئے گا؟ تم کسی پُر کیف موقع کو بھی کامل طور پر خوشگوار لمحہ میں نہیں بدل سکتے۔" میں سمجھتا تھا کہ وہ ٹھیک کہتی ہوگی میں ہمیشہ تنہائی پسند اور کتابی کیڑا قسم کا انسان رہا ہوں۔ پیار میں کچھ پہل کرنی پڑتی ہے۔ کچھ پیشقدمی اور میں شاید ایسا نہیں کرتا تھا۔ اس کے اس انداز سے مجھے دُکھ ہوتا لیکن پھر جب اچانک وہ مسکرا کر ہنس کر اپنے ہاتھوں سے میرے بال پریشان کر دیتی تو گویا سب کچھ ٹھیک ہو جاتا۔

جب دو مہینوں کے قیام کے بعد میں لکھنو واپس آیا تو اس بار میرا دل بہت اُداس تھا۔

اس کے بعد میں جب بھی دہرہ دون جا سکتا، جاتا کبھی ایک دن کے لیے کبھی دو دن کے لیے۔ سا کا سے ملاقات ہوتی، آہستہ آہستہ وہ اور بھی جلدی جلدی اُلجھنے لگی اور پھر بات یہاں تک پہنچ گئی کہ کئی بار وہ سارا سارا دن اُلجھی رہتی اور جب میرے جانے کا وقت ہوتا تب وہ مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑ لیتی اور پوچھتی۔ "پھر کب آؤ گے؟" اس سوال سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے اگر وہ واقعی یہ چاہتی تھی کہ میں آؤں تو میرے آنے پر اس کا میرے ساتھ ایسا برتاؤ کیوں؟

ایک بار جب میں اس کے فلیٹ میں پہنچا تو دیکھا کہ سب سامان بندھا پڑا ہے۔ دیواروں پر سے تصویریں اتار دی گئی ہیں۔ کتابیں اور ریکارڈ پیک کر دیے گئے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ کوچ کی تیاری ہے۔ راکا نے مجھے بتایا کہ وہ

دہرہ دون چھوڑ کر جا رہی ہے۔ پچھلے چند مہینوں سے وہ ایک ٹروپ تیار کر رہی تھی۔ اب وہ ٹروپ تیار ہو گیا تھا اور حکومتِ ہند نے اس ٹروپ کو کچھ بیرونی ممالک کے دوروں کے لیے بھی چن لیا تھا۔ باہر جانے سے پہلے وہ ہندوستان کے مختلف حصوں کا دورہ کرنا چاہتی تھی اور اس طرح وہ تقریباً ڈیڑھ دو سال تک دورے پر رہنے والی تھی۔ اس دن وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی لیکن باتیں کرتے کرتے کبھی کبھی اچانک اُداس بھی ہو جاتی تھی۔ اپنے اس ٹروپ کے بارے میں وہ اکثر مجھ سے باتیں بھی کیا کرتی تھی۔ مجھے اس کی آرزو کی تکمیل پر خوشی ہوئی۔ لیکن یہ سوچ کر بڑی تشویش بھی ہوئی کہ اب ہمارے آپسی تعلقات کا کیا ہو گا؟ اس دن پہلی بار میں نے حسد کی کسک محسوس کی اور دُعا کی کہ اس کے پروگرام کسی نہ کسی طرح منسوخ ہو جائیں۔ میں اتنی ہمت بھی نہ کر سکا کہ اس سے پوچھ ہی لیتا کہ ہمارے مستقبل کا کیا ہو گا۔ اور نہ ہی اس نے اس موضوع پر منھ کھولا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں خاموشی سے اس کا انتظار کروں گا اور اگر نہ رہ گیا تو خط لکھ کر پوچھ لوں گا۔ خط و کتابت ہی میں ایسی بات چیت کرنا آسان ہوتا ہے۔ اگر وہ چاہتی تو میں اپنا سب کام چھوڑ کر اس کے ساتھ ہو لیتا لیکن اس نے کبھی ایسا اشارہ تک بھی نہیں کیا۔ اور مجھے یقین تھا کہ اگر میں خود اپنے آپ کو آفر کروں تو وہ میرا اور میرے تھیسس کا مذاق اُڑائے گی۔ اور یہ بات میں کبھی برداشت نہ کر سکتا تھا۔

اس بار جب میں لکھنؤ آیا تو مجھے ایسا لگا جیسے کہ میری زندگی سے مقصدیت کا عنصر نکل چکا ہے۔ مجھے زندگی کی تمام باتوں میں، تمام چیزوں میں ایک کھوکھلے پن کا احساس ہونے لگا۔ ریسرچ، ڈاکٹریٹ، سیاسیات میں نئی تھیوری، کارل مارکس سب فضول نظر آنے لگے۔

را کا سے خط ملنے کی مجھے کوئی خاص اُمید نہیں تھی۔ مہینے گزر گئے اور مجھے

اس کا کوئی خط نہ ملا۔ چونکہ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں تھا، اس لیے میں بھی خط نہ لکھ سکا۔ حالانکہ ہمارے درمیان کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی پھر بھی مجھے ایسا لگتا تھا جیسے کہ ہم میں قطع تعلق ہو گیا ہو۔ بظاہر میں اپنا ریسرچ کا کام کرتا لیکن تھیسس تھا کہ جوں کا توں پڑا تھا میرے وظیفے کی میعاد تین سال تھی اور ابھی ایک سال سے زیادہ وقت میرے پاس باقی تھا۔ پھر بھی مجھے اب اس موضوع میں وہ پہلے والی دلچسپی نہ رہ گئی تھی۔ میں راکا کے پروگراموں کے بارے میں اخباروں میں اکثر پڑھ لیا کرتا تھا۔ کہیں گورنر، کہیں چیف منسٹر اور کہیں میئر ان کا افتتاح کرتے تھے۔

پھر ایک دن میں نے پڑھا کہ وہ بیرونی ممالک کے دورے پر چلی گئی ہے۔

اس طرح دو سال سے کچھ اوپر ہی بیت گئے۔ میرے وظیفے کی میعاد میں ایک سال کی توسیع کر دی گئی۔ میں اب بھی لکھنؤ یونیورسٹی میں اپنے تھیسس کی تیاری میں جٹا ہوا تھا۔ ایک دن جب میں لائبریری سے واپس آیا تو مجھے دو خط ملے۔ ایک گھر سے آیا تھا جس میں لکھا تھا کہ ہماری جائیداد کا بٹوارہ کر دیا گیا ہے اور میرے حصے میں دس ہزار روپے آئے ہیں۔ خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ اگلے ہی مہینے سے میں انھیں جس طرح چاہوں، خرچ کر سکتا ہوں۔

دوسرا خط مصر سے راکا نے لکھا تھا "میں دس تاریخ کو دلی آ رہی ہوں۔ امپیریل ہوٹل میں ٹھہروں گی۔ اگر مجھ سے مل سکو تو بہت اچھا ہو گا" راکا چھ دن بعد ہی دہلی آنے والی تھی۔ مجھے لگا جیسے ٹھنڈی ہوا کا ایک جھونکا ماضی کی یاد لے آیا ہو۔ راکا کا چہرہ، اس کے ہونٹ، اس کی باتیں ایک دم پھر سے ابھر آئیں کیا اب بھی راکا ویسی ہی ہو گی؟ ہم تقریباً ڈھائی سال کے بعد مل رہے تھے۔ اس نے مجھے خط لکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے اسے میری یاد تو آئی ہی ہو گی۔

اب میں اس انتظار میں تھا کہ کیسے پانچ دن گزریں اور میں اس

سے ملوں۔

پچھلے دن کی صبح میں دلّی میں تھا۔ میرا دل بلّیوں اُچھل رہا تھا۔ نہ جانے راکا کیسے ملے۔ میں اس سے کتنے ہی شکوے کروں گا۔ اس نے مجھے خط کیوں نہیں لکھا؟ میں اسے یاد آیا کہ نہیں؟ انھیں خیالات میں گم، میں ہوٹل پہنچا۔

میں نے دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ اندر سے آواز آئی ——

"آجایئے ——" آواز راکا ہی کی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا —— سامنے راکا کھڑی تھی۔ پہلے سے کچھ موٹی۔ بال نئے طریقے سے گُندھے ہوئے تھے۔ کپڑے کچھ بدیشی سے۔ لیکن تھی علین مین وہی لڑکی۔ پوری پھیلی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے میرا استقبال کیا اور داہنے بازو سے اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

"آؤ —— بیٹھ جاؤ —— جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ۔"

میں کچھ بول نہ سکا۔ ہم ڈھائی سال کے بعد ملے تھے اور وہ مجھے بیٹھنے کے لیے ایسے دعوت دے رہی تھی، جیسے بہت ذرّہ نوازی کے موڈ میں کوئی وائس چانسلر کسی جونیر لکچرار کو بیٹھنے کی اجازت دیتا ہے "جہاں جی چاہے بیٹھ جاؤ" کہہ کر گویا اس نے مجھے جنت میں آنے کی دعوت دے دی تھی۔

میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ ہوٹل کے فرنیچر اور کیلنڈر کے سوا کمرے میں سجاوٹ کا اور کوئی سامان نہیں تھا۔ اس کا اپنا سامان بھی مختصر سا تھا۔ کھڑکی کھلی تھی اور کھڑکی سے باہر کی ٹریفک دکھائی دیتی تھی۔ میں کھڑکی کی چوکھٹ سے سہارا لے کر کھڑا ہوگیا اور اس کی طرف پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ دیکھنے لگا۔ دراصل اس کے ایسے استقبال سے میرا دل اچانک کچھ بجھ سا گیا تھا۔

دفعتاً وہ ہنسنے لگی۔ زور زور سے پورا منھ کھول کر۔ مجھے اس ہنسی کی کوئی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ "تم ہنس کیوں رہی ہو؟" میں نے پوچھا۔ وہ سُنی ان سُنی کرکے ہنستی

رہی۔ پھر میرے پاس آکر میرے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگی۔ اس کی اس ادا پر مجھے کچھ کچھ غصہ بھی آیا۔ میں نے پھر پوچھا "آخر ہنسنے کی کیا بات ہے؟"

ہنسی بند کر کے وہ میری طرف گھورتی ہوئی بولی "تم مسکرا کیوں رہے ہو؟ وہی طریقہ، وہی عادتیں۔ تم بالکل بدلے نہیں۔ ویسے کے ویسے ہی ہو۔ بدّھو!"

بدّھو یا انگریزی میں (SILLY) وہ مجھے اکثر پکارا کرتی تھی۔ لیکن آج اس کا یہ برتری والا رویّہ مجھے پسند نہ آیا۔ میں نے چڑ کر کہا — "ہاں ٹھیک ہے۔ تم دُنیا دیکھ کر آئی ہو۔ میں ٹھہرا کنویں کا مینڈک! بدل کیسے سکتا تھا؟ ۔ اور اب تو ڈھائی سال سے دہرہ دون تک بھی نہیں جا سکا۔" میں نے اپنی طرف سے وار کیا تھا لیکن اس پر کچھ اثر نہیں ہوا — "جانتے ہو" وہ ایک دم سنجیدہ ہو کر کہنے لگی۔ — "تم مجھے بہت یاد آتے رہے۔ ہر روز — تقریباً ہر لمحہ۔"

"زہے نصیب" میں نے اسی مایوسی بھرے لہجے میں کہا۔

"اور جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ تم بالکل بدلے نہیں اور میں جانتی تھی کہ تم بالکل نہیں بدلو گے۔ اسی لئے بڑی آسانی سے تمہیں یاد کر سکتی تھی وہی بکھرے بال، چوڑا ماتھا، تیلا جسم، کالا کوٹ۔" اور پھر کپڑوں کی طرف دیکھ کر اچانک بولی — "ارے وہ تمہارا کوٹ کدھر گیا؟ میں نے غلط سمجھا تھا کہ تم بالکل نہیں بدلے۔ تمہارا کوٹ تو بدل گیا ہے۔ کیا ہوا؟"

"مر گیا" میں نے کہا — "تمہارا انتظار نہ کر سکا۔" پھر میں نے بات بدلنے کے لیے پوچھا — "کہاں کہاں ہو کے آئی ہو تم؟"

"بس یوں سمجھو کہ تمام دنیا کا چکر لگا آئی ہوں۔ لیکن اب تھک گئی ہوں۔ اس کام سے میرا جی بھر گیا ہے۔ اب تو میں بس کہیں ٹک جانا چاہتی ہوں۔"

دور کہیں سے ایک کرن پھوٹی۔ کچھ دیپ جگمگائے۔ ایک دم میرے تمام

جسم میں جیسے کوئی لہر دوڑ گئی۔ باہر سورج غروب ہو چکا تھا۔

"کام کا کیا کرو گی اب؟ ۔۔۔ امیر پیاریو، ایکٹنگ، وہ سب کچھ کیا ہوا؟"

"بس اب ایکٹنگ کے رول مجھے پسند نہیں۔ کوئی بھی رول مجھے نہیں بھاتا اور پھر میرے ٹروپ کے ساتھ میرے کچھ اختلافات بھی ہو گئے ہیں۔"

اتنے میں بیرا چائے کی ٹرے لے کر آ گیا۔

اس نے دو پیالیاں بنائیں۔ ایک مجھے دی اور ایک خود لے لی۔ پھر چائے کا ایک گھونٹ پی کر اس نے اچانک کہا

"اچھا، اب تم اپنی بتاؤ۔"

"میرا کیا ہے؟ تم نے خود ہی تو کہا ہے کہ میں نہیں بدلا۔ بس جہاں چھوڑ گئی تھیں، وہیں ہوں۔"

"اچھا میں بدلی ہوں کہ نہیں؟"

"ہاں ۔۔۔"

میری بات بیچ میں ہی کاٹ کر اس نے کہا ۔۔۔ "کچھ موٹی ہو گئی ہوں۔ اس کے علاوہ اور کوئی تبدیلی؟"

"اب ساری دنیا دیکھ کے آئی ہو۔ کتنی بدلی ہو یہ ایک دم کہنا تو مشکل ہے ۔۔۔ میں نے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا ۔۔۔ "اچھا اب کیا پلان ہے تمھارا؟"

"پلان؟" ۔۔۔ اس نے بے توجہی سے جواب دیا "بہت پلان ہیں۔"

میں چائے کی پیالی پی چکا تھا۔ اس نے بھی اپنی پیالی میز پر رکھ دی پھر ایک دم اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر بولی ۔۔۔ "اچھا دیکھو چھ بجے مجھ سے کوئی اور ملنے

آرہا ہے۔"

چھ بجنے میں پانچ منٹ تھے۔ مجھے گویا چلے جانے کا اشارہ مل چکا تھا۔ میرا کلیجہ ایک دم منہ کو آ گیا۔ گلا ایک دم سوکھ گیا۔ یہ الوداع!! میرے دل میں جو اسے گلے سے لگانے اور اس کا منہ چوم لینے کی خواہش پیدا ہوئی تھی وہ ایک دم ٹھنڈی ہو گئی۔ میں نے نہ جانے کیوں اس سے پوچھ لیا "اب کب ملاقات ہو گی؟"

"اب ——" اس نے ایک لمحے کے لیے سوچا۔ جیسے اپنے ذہن میں ڈائری کے ورق الٹ رہی ہو۔ پھر گویا اسے اگلے دن کا ورق مل گیا —— "کل تو میں بمبئی جا رہی ہوں۔ شام کے چھ بجے کی گاڑی سے۔"

"اچھا میں اسٹیشن پر آؤں گا۔" میرا اشتیاق پھر جاگ اٹھا۔

"نہیں میرے ساتھ کوئی اور ہو گا۔"

"اچھا۔" میرے سینے پر جیسے کسی نے ہتوڑا مار دیا۔ "اس سے پہلے؟ کل ہی فری ہوں۔" میں نے بالکل یتیموں کے سے لہجے میں پوچھا۔

"اوہو —— کل تو میں بہت مصروف رہوں گی۔ صبح رانسن آ رہا ہے اور مجھے بہت سی شاپنگ بھی کرنی ہے۔"

تو یہ ہماری آخری ملاقات تھی؟ میں بالکل رو ہی پڑا۔ یہ رانسن کون تھا؟ وہی تو نہیں جو مسز رائے کے گروپ میں بھی تھا۔ آکسفورڈ کا لکچرار۔ ہندوستان کی سیاسی زندگی پر ڈاکٹریٹ کر رہا تھا۔

"تو پھر کب ملو گی؟ —— بمبئی سے کب واپس آ رہی ہو؟"

"بمبئی سے واپس نہیں آؤں گی۔ وہاں سے ہم انگلستان جا رہے ہیں۔ میں اور رانسن" اور پھر کچھ وقفے کے بعد بولی —— "رانسن کو تم جانتے ہو نا؟ وہی جس کو تم برہمن کہہ کر چڑایا کرتے تھے۔"

میں ہاں بھی نہ کہہ سکا۔۔۔ اب تک بڑی کوشش سے اپنے آنسو روکے ہوئے تھا۔ راکا نے دروازہ کھولا۔ ہم دونوں کچھ دُور تک ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ پھر راکا رُک گئی۔ اپنا ہاتھ آگے بڑھا کر بولی "اچھا الوداع"

میں باہر آیا۔ ہوٹل کے باوردی چوکیدار نے سلام کرکے پوچھا۔۔۔ "ٹیکسی؟" میں جواب دیئے بغیر آگے بڑھ گیا۔ کدھر جارہا تھا؟ مجھے معلوم نہیں تھا۔ جب ایک سمت چلتے چلتے تھک گیا تو پھر دوسری طرف مڑ گیا۔ مجھے دیکھ کر کئی ٹیکسی والے اپنی کار کی رفتار دھیمی کرلیتے۔ کھڑکی سے سر نکال کر کچھ پوچھتے پھر جواب نہ پاکر آگے بڑھ جاتے۔ دیر گئے میں واپس آیا۔ کھانے کی خواہش بالکل نہ تھی۔ منہ کا ذائقہ بالکل خراب ہوچکا تھا۔ ویسے ہی سو گیا۔

صبح اٹھ کر میں نے سوچا راکا ضرور مذاق کر رہی ہوگی۔ ضرور میرا انتظار کر رہی ہوگی لیکن ہوٹل جانے کی بھی مجھ میں ہمت نہ ہوئی۔ اگر وہ وہاں نہ ہوئی تو میں واپس نہیں آسکوں گا۔ سوچا فون کرکے پوچھ لوں لیکن فون کرنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

شام کو میں غیر ارادی طور پر اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ گاڑی کے جانے کا وقت چھ بج کر پانچ منٹ تھا۔ ابھی سوا پانچ ہی بجے تھے کہ میں پلیٹ فارم پر پہنچ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر گھومنا شروع کردیا۔ پونے چھ بجے میں نے دیکھا گیٹ سے رانسن اور راکا ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ انھوں نے مجھے دیکھا نہیں۔ دونوں سیدھے اپنے ڈبے میں گھس گئے۔ پھر رانسن باہر نکلا۔ کچھ میگزین اور اخبار خریدے۔ اور پھر ڈبے کی طرف بڑھ گیا۔ میں راکا کو دیکھ رہا تھا۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اس نے بھی مجھے دیکھا ہے۔ ایک دم اس نے کھڑکی کا پٹ نیچے گرا دیا۔

وہ میرے لیے راکا کا آخری دیدار تھا۔

گاڑی پتہ نہیں کب چلی گئی۔ پلیٹ فارم کا ہجوم باہر کی طرف نکل رہا تھا۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا۔ باہر کچھ ٹھنڈی سی ہوا چل رہی تھی۔ میرا دل چاہا کہ باہر لان میں جا کر بیٹھوں۔ پھر میں نے سوچا گھر چلوں۔ لیکن اتنی جلدی جا کر بھی کیا کروں گا جس دوست کے ہاں میں ٹھہرا ہوا تھا وہ بھی ابھی باہر ہی ہوگا۔

اچھا ہے۔ اکیلے ہی اچھا رہے گا لیکن اگر وہ گھر میں ہوا تو پھر اس سے کچھ باتیں کرنا پڑیں گی اور میرا موڈ کسی سے باتیں کرنے کا نہیں تھا۔ پھر میں نے ایک اسکوٹر رکشا لی اور اسے کناٹ پلیس چلنے کو کہا۔ اسکوٹر چلا تو اس کے شور نے میرے اکیلے پن اور خاموشی کے احساس کو کچھ کم کیا۔ ہوا اب بھی زور زور سے منہ پر تھپیڑے مار رہی تھی۔ میرے بال اڑ رہے تھے اور ہوا کے تھپیڑوں سے آنکھوں میں سے پانی بھی آنے لگا تھا۔ راکا اب بیس پچیس میل دور جا چکی ہوگی۔ میل ٹرین کی وہی چل چل فنا فنٹ چل چل فنا فنٹ میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔ اس نے شاید اب کھڑکی کا شیشہ اونچا کر دیا ہوگا۔ اس کی آنکھوں پر بھی ہوا کے جھونکے لگ رہے ہوں گے۔ اس کی آنکھوں میں بھی پانی آ رہا ہوگا۔

"بدھو۔۔۔ یوسفی" ۔۔۔ راکا کا قہقہہ میرے کانوں میں گونجا ۔۔۔ "پھر جذباتی بن گئے" پھر میں ڈرائیور کی پیٹھ کو دیکھ کر شرمندہ سا ہو گیا اور مسکرا دیا۔

کناٹ پلیس میں رکشا روک کر ڈرائیور نے بظاہر میٹر کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک روپیہ پچیس تنئے پیسے۔" میں جانتا تھا یہ بہت زیادہ کرایہ ہے لیکن میں تکرار کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ میں نے جھٹ جیب میں سے پیسے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیئے اور اتر پڑا۔

ابھی میں دو قدم ہی چلا ہوں گا کہ پیچھے سے کسی نے میری پیٹھ پر ہاتھ رکھا

میں نے مڑ کر دیکھا چہرہ کوئی جانا پہچانا جان پڑتا تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے پہچاننے کی کوشش کی۔ ارے ہاں کالج میں ہمارے ساتھ ہی تو پڑھتا تھا لیکن نام یاد نہیں آیا۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔ "چلو آج ہمارے ساتھ کھانا کھاؤ۔ آج ہم ڈاکٹر بن گئے ہیں پی۔ ایچ۔ ڈی۔"

میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ اس وقت مجھے کوئی بھی شخص اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ کہیں بھی!

ہم دونوں اسٹینڈرڈ میں گھس گئے۔ "تمہارا کیا حال ہے؟ کب ڈاکٹر بن رہے ہو؟"

"دیکھو" میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ کھانے کے دوران میں خاموش بیٹھا رہا۔ اس نے دو تین بار گفتگو شروع کرنے کی کوشش کی پھر مجھے اس موڈ میں دیکھ کر وہ بھی خاموش ہو گیا۔ کھانے کے بعد ہم جدا ہو گئے۔ اگلے دن سویرے میں لکھنؤ واپس چلا گیا۔ جاتے وقت ایک ہفتے کی غیر حاضری کی اجازت لے کے گیا تھا۔ چار دن کے بعد ہی واپس آ گیا۔ جاتے وقت خیال تھا کہ شاید چھٹی کی مدت میں توسیع کرنی پڑے لیکن تین دن کی چھٹی بچا لایا تھا۔ اپنے کمرے میں آ کر میں نے کتابوں کی الماری کو دیکھا۔ موٹی موٹی بے جان کتابیں۔ پھر اپنے تھیسس کو اٹھا کر دیکھا پانچ پارٹ ختم ہو چکے تھے۔ کاغذوں کا وزن ایک سیر کے قریب ہو گا۔ انھیں میں میری ڈاکٹریٹ پڑی ہے۔ انھیں میں دہرہ دون، مسز رائے، راکا اور رانسن —— تھیسس میں ایک دو جگہ میں نے رانسن کا حوالہ بھی دیا تھا۔ جوں جوں تھیسس کا وزن بڑھتا جاتا تھا میں خوش ہوا کرتا تھا لیکن اب یہ تھیسس بالکل کھوکھلا لگ رہا تھا، اسے میں اپنی چھوٹی انگلی سے اٹھا سکتا تھا۔ انگلی پر اس کا بوجھ بالکل محسوس نہیں ہو رہا تھا پھر بھی یہ وزنی تھا۔ یہ تھیسس تھا۔ یہ کمرہ تھا۔ راکا تھی۔ راکا ہے۔ وہ اب بمبئی میں

شاپنگ کر رہی ہوگی۔ میں ہوں اور میں یہاں اس کمرے میں ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں!! اگر میں سوچنا بند کردوں تو؟ لیکن میں سوچنا کیسے بند کرسکتا ہوں۔ میں ہوں اور میں سوچوں گا۔ میں اپنی سوچ سے ہی راکا کو جنم دیتا ہوں۔ اس سے شاپنگ کرواتا ہوں۔ ہوسکتا ہے کہ راکا کی ٹرین کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہو اور وہ اس وقت زندہ نہ ہو لیکن میری سوچ اسے پھر زندہ کرسکتی ہے۔ میرے تھیسس کا پہلا فقرہ ہی یہ تھا "انسان سوچنے والا جانور ہے"۔

میز پر راکا کا وہ خط پڑا ہوا تھا۔ جو مجھے دہلی لے گیا تھا۔ خط وہیں تھا اور میں دہلی ہوکر واپس بھی آگیا تھا۔ یہ دوسرا خط میری ماں کا تھا یہ بھی اس کے ساتھ ہی آیا تھا۔ ماں نے پوچھا تھا۔ "تمہارا پلان کیا ہے؟" "میرا پلان؟" پلان وہ بناتے ہیں جو کچھ سوچتے ہیں اور میں سوچنا بند کرنا چاہتا ہوں —— لیکن اب دس ہزار روپیہ میرے نام ہے۔ اگر میں ماہانہ دو سو روپیہ بھی خرچ کرتا رہوں تو چار سال دو مہینے تک گزارہ ہوسکتا ہے۔ اور اس کے بعد؟ —— اس کے بعد —— پھر سوچ! میں نے بہت سوچ لیا ہے۔ میں سوچ سوچ کے تھک گیا ہوں۔ اب فیصلہ کرنا ہے۔ بغیر سوچ کے فیصلہ کم سے کم سوچ کے بعد فیصلہ —— میرا پلان؟ —— میں نے اس خط پر جلی حروف میں لکھ دیا —— "کچھ بھی نہیں" پھر میں نے ایک کاغذ لیا اور یونیورسٹی کو چٹھی لکھی کہ میں اب ریسرچ کرنا نہیں چاہتا۔ پھر میں نے سامان باندھنا شروع کر دیا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مجھے سیاسیات یا فلاسفی کو کوئی خاص الخاص چیز نہیں دینا ہے وہ وہم تھا میری سوچ کا۔ سقراط، افلاطون، ارسطو، ہیگل، مارکس، فرائڈ کے پوتھے پڑھ کر میرا دماغ خراب ہو گیا تھا۔ کونسی معرکہ آرا چیز وہ دنیا کو دے گئے آخر؟ سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ ارسطو کو جلاوطنی ملی۔ مارکس ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرا۔ فرائڈ دوسروں کے جنسی معاملات کی تہ تک پہنچنے کی کوشش میں لگا رہا۔

ان سب کو سوچ نے مارا۔ ان کی فکر نے دنیا کے باقی لوگوں کے سکون کو ہی خراب کیا۔

ایم۔ این رائے نے کیا کیا؟ وہ بے کار ہوا میں پر پھڑپھڑاتا رہا لیکن اس کو ایلین مل گئی تھی۔ اسے اپنے متعلق کوئی بھی فکر نہ تھی۔ وہ سوچتا تھا دوسروں کے لئے یہ بھی تو ایک طرح کی عیاشی ہے۔ دوسروں کے لیے سوچنا۔ نہیں مجھے ایم۔ این رائے پر اور کچھ نہیں لکھنا ہے۔ اس سے شاید چند اور لوگ گمراہ ہو جائیں۔

سوچ ہر تکلیف کی جڑ ہے۔ میں نے اپنے متعلق کیا کچھ سوچا تھا۔ کتنے ہوائی قلعے بنائے تھے۔ میری سوچ مجھے صدیوں آگے لے گئی۔ میں اپنا مقام، اپنا آپ بھول گیا۔ میں نے راکا کے ساتھ جھولے جھولے۔ یونیورسٹی کی پروفیسری اور ایک خوب صورت گھر کے خواب دیکھے۔ میں نے کتنا سوچا تھا؟ کتنا پلان کیا تھا؟ — اور میری سب سوچ سارے پلانوں کو ایک بیس سال کی لڑکی درہم برہم کر کے چلی گئی تھی۔ میرے سارے ہوائی قلعے اس نے آن کی آن میں مسمار کر ڈالے تھے۔ میری سوچ کا کیا فائدہ ہوا؟ رانس وہ کھنڈرا ڈاکٹر، جسے ہم سب برہمن کہہ کر چڑایا کرتے تھے وہ سب کچھ لے گیا۔ اس کا تھیسس مکمل ہو چکا تھا۔ اس کی کتاب چھپ رہی تھی۔ اور اسے راکا مل گئی تھی۔

میں نے اب فیصلہ کر لیا ہے کہ سوچنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ میں کہیں بھی نوکری کر سکتا ہوں کسی کے ساتھ بھی شادی کر سکتا ہوں۔ میں نے اب سوچنا بند کر دیا ہے۔ میں ہوں — اتنا ہی کافی ہے۔ کیوں ہوں؟ — اس کے بارے میں سوچنے کی ضرورت نہیں — کوئی فائدہ نہیں!!

بدحواسیاں

خدا جب جنت میں فرشتوں کی صحبت سے بور ہو گیا تو اس نے انسان کو پیدا کیا۔ یہ تخلیق کچھ ایسی نکلی کہ فرشتے بھی اس سے مات کھا گئے اور شاید اسی وجہ سے انسان کو زمین پر آ ترنا پڑا۔ کہنے کو تو یہ مٹی کا پتلا ہے لیکن کیا غضب کا پتلا ہے۔ نہ جانے کہاں سے مٹی منگوائی گئی ہوگی اس پتلے کو بنانے کے لئے! پلاسٹک اور چینی تک کے پتلے اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے! اور تو اور انسان خود اپنی تعریف میں اپنے آپ کو اشرف المخلوقات جیسے القاب سے نوازتا ہے۔

انسان اور حیوان میں تفریق کی کئی نشانیاں ہیں۔ انسان بول سکتا ہے۔ چل سکتا ہے اور چغلی کر سکتا ہے۔ صرف یہ فرق ہی انسانی برتری کو نہیں ظاہر کرتا۔ ایک اور اہم فرق جسے اب تک نظر انداز کر دیا گیا ہے یہ ہے کہ عالم حیوانات و نباتات میں انسان ہی وہ واحد تخلیق ہے جو بدحواس ہو جاتی ہے۔ باقی سب جانوروں کا ردِ عمل اپنی فطرت کے مطابق ہوتا ہے لیکن انسان کا معاملہ

اور ہے کیوں کہ انسان سوچتا ہے، اپنے حواس استعمال کرتا ہے اس لیے بعض اوقات بدحواس بھی ہو جاتا ہے۔

ہر انسان کسی نہ کسی وقت ضرور بدحواس ہوتا ہے۔ کوئی کم کوئی زیادہ۔ کوئی آج کوئی کل، کوئی کبھی کبھار کوئی روز روز، کوئی ایک دفعہ، کوئی مستقلاً لیکن زندگی میں اس پر کبھی کبھی بدحواسی کا طاری ہونا لازمی سا ہے۔ اس کے بغیر زندگی میں رس نہیں، چاشنی نہیں۔ بدحواسی محبت کی جڑواں بہن ہے۔ ہر انسان کی زندگی میں ایک ایسا لمحہ بھی آتا ہے جب اسے کسی سے محبت ہو جاتی ہے — اور ساتھ ہی یا کئی بار اس سے پہلے ہی اس پر بدحواسی کا بھی دورہ پڑتا ہے۔ میں نے آج تک کوئی انسان ایسا نہیں دیکھا جو اپنی زندگی میں کبھی نہ کبھی بدحواس نہ ہوا ہو۔ اور سوئے اتفاق سے اگر دنیا میں کہیں کوئی ایسا انسان ہو بھی تو میں دعا کروں گا کہ اس سے میری ملاقات نہ ہو کیوں کہ اس سے مجھے کوفت کے علاوہ بدحواسی بھی ہو گی۔

ہماری زندگی میں کتنے ہی ایسے مرحلے آتے ہیں جب ہم بجا طور پر بدحواس ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلا مرحلہ پیدائش کے وقت درپیش ہوتا ہے۔ ہسپتال کے ڈلیوری روم کا موٹو "بدحواسی" ہی ہوتا ہے۔ نرس بدحواس، نیا نیا ڈاکٹر بدحواس، ناتجربہ کار نرس بدحواس، اردگرد کے لوگ بدحواس، اکثر گھروں میں اگر لڑکی پیدا ہو جائے تو ہوش آنے پر ماں بدحواس — اور پھر ساس بدحواس۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اس مرحلے پر خود بدحواس ہونے کے بجائے انسان دوسروں کو زیادہ بدحواس کر دیتا ہے۔ باپ تو نہایت ہی بدحواس ہوتا ہے اور کم از کم اس معاملے میں تو ہم ہندوستانیوں کو احساسِ کمتری کا شکار نہ ہونا چاہیئے۔ کیوں کہ انگریز، امریکن،

اور روسی سب باپ اس موقع پر بدحواس ہوتے ہیں۔ اور میرا تجربہ ہے کہ اگر باپ بدحواس نہ ہو تو ماں بہت برا مناتی ہے۔ اس لیے یہ ایک قسم کی رسم سی بن گئی ہے۔

انٹرویو کی بدحواسیوں کے متعلق تو ایک پی۔ ایچ۔ ڈی کا تھیسس لکھا جا سکتا ہے۔ روزگار اور بے روزگاری کے درمیان زندگی اور موت کا فرق ہے۔ اس لیے لب بام پہنچ کر تو بدحواسی لازمی ہے۔ انٹرویو کے دوران انسان کی عجیب حالت ہو جاتی ہے۔ کئی بے چارے تو منہ ہی نہیں کھول سکتے۔ کئی منہ کھولتے ہیں تو بند نہیں کر سکتے۔ کئی بند کرنے کے بعد پھر نہیں کھول سکتے۔ کئی لوگ سوال "چینا" ہو تو جواب "گندم" دیتے ہیں۔ آج کل مقابلے کا زمانہ ہے۔ ہر جگہ' ہر نوکری کے لیے مقابلے کے امتحان ہوتے ہیں جن کے آخر میں انٹرویو کا دُم چھلہ لگا ہوتا ہے۔ اس لیے انٹرویو کے بارے میں بہت سے ہدایت نامے بھی چھپ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر وہ شخص جو ایک دو بار انٹرویو دے کر ناکام لوٹ چکا ہو، اس موضوع کا ایکسپرٹ بن کر اور نوجوانوں کو پند و نصائح دے کر ان کی زندگی خراب کرنے کی کوشش کرتا ہے "بلائے جانے پر سینہ تان کر اندر داخل ہونا چاہیے۔ گڈ مارننگ دھما کے کے ساتھ کہنا چاہیے۔ کوئی کہے نہ کہے کرسی گھسیٹ کر خود ہی بیٹھ جانا چاہیے۔ پیاس لگے نہ لگے خود اعتمادی کے اظہار کے لیے پانی کا گلاس مانگ لینا چاہیے" وغیرہ وغیرہ۔ ایک مدرسۂ فکر کی رائے کے مطابق ہر بات کا جواب سوچ سمجھ کر دینا چاہیے۔ اگر صحیح جواب معلوم نہ ہو تو اعتراف کر لینا چاہیے۔ دیانتداری سب سے اچھی پالیسی ہے۔ اس سے وہ بوڑھے خرانٹ لوگ بہت متاثر ہوتے ہیں۔

دوسرے مدرسۂ فکر بلکہ "بے فکر" کی رائے ہے کہ جواب معلوم ہو نہ ہو، ہار نہیں ماننی چاہیے۔ کوئی نہ کوئی جواب ضرور دینا چاہیے۔ انٹرویو لینے والوں کو خود کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ ان کے سوالوں کے جواب کیا ہیں جس شخص نے

ہمیں انٹرویو کے لیے تیار کیا وہ ایک درمیانی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ شخصیت ہی اہم چیز ہے۔ بس اسے جاذبِ نظر بنانا چاہیئے۔ ہمیشہ ہنس مکھ رہنا چاہیے اور انٹرویو میں ہر سوال کا جواب مسکرا کر دینا چاہیئے۔ ہم نے کئی انٹرویوز میں اس کی نصیحت پر عمل کیا۔ ہر سوال کا جواب دینے سے پہلے مسکرا دیتے۔ کئی سوالوں کے جواب میں تو دل کھول کر ہنس بھی دیتے۔ نتیجے کے طور پر انٹرویو کے بعد دل کھول کر رونا بھی پڑا۔

انٹرویو کم از کم دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جس کا ابھی ذکر کیا ہے۔ یعنی جن کا تعلق پیٹ کی آگ بجھانے سے ہوتا ہے اور دوسرا دل کی آگ بجھانے سے متعلق۔ اس انٹرویو کی تب ضرورت پڑتی ہے جب نوجوان ڈرپوک قسم کا ہو اور شریک حیات کی تلاش میں خود کچھ کرنے کے بجائے سارے کنبے کی مدد لے رہا ہو۔

اس ضمن میں مجھے ایک پرانا واقعہ یاد آیا جب میں بھی اسی مرحلے پر تھا۔ میرے والدین میرے لیے کسی لڑکی کی تلاش میں تھے۔ ایک دن جب میں بمبئی سے لکھنؤ جارہا تھا تو راستے میں ایک پرانا دوست مل گیا۔ جب اسے ہماری ضرورت کے متعلق پتہ چلا تو اس نے بتایا کہ اس کی ایک چچازاد بہن دہلی کے ایک بہت ماڈرن قسم کے کالج میں پڑھتی ہے اور اگر میں چاہوں تو اُسے دیکھ سکتا ہوں۔ اس کالج کے بارے میں ہم نے سُن تو رکھا تھا کہ وہاں کی چھوکریاں بڑی زبردست ہوتی ہیں اور سماج کے موجودہ تقاضوں پر سوا سو نئے پیسے پوری اُترتی ہیں۔ وہاں میری بھی دُور کے رشتے کی ایک بہن پڑھتی تھی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ سوموار کے روز میں ان کے کالج میں جاؤں اور ایک مقررہ وقت پر میری بہن اس لڑکی کے ساتھ باہر لان میں مجھے ملے۔ بہ ظاہر میں اپنی بہن سے ملنے جاؤں گا اور اگر وہ لڑکی مجھے پسند آجائے تو پھر بات آگے بڑھائی جا سکے گی۔

دہلی میں میرے ایک سگے چچا اور بہت سے اور بھی رشتہ دار رہتے تھے۔ لیکن میں عموماً اپنے ایک پرانے دوست کے یہاں ٹھہرا کرتا تھا۔ ایک تو وہ میرا ہم عمر اور ہم ذوق تھا اور دوسرے وہ پولیس میں کپتان تھا۔ اس کے پاس ایک کار بھی تھی۔ جس پر پولیس کا جھنڈا لگا رہتا تھا اور اس کار میں گھومنے پھرنے سے رعب پڑنے کے علاوہ کام بھی بہ آسانی ہو جاتے تھے۔ مقررہ دن میں نے اپنے دوست کی کار لی اور اُسے بغیر کچھ بتائے کالج کی طرف چل پڑا۔ یہ زندگی میں پہلا موقع تھا کہ میں لڑکیوں کے کالج میں کسی سے ملنے جا رہا تھا۔ مزے سے گنگناتا ہوا میں وہاں پہنچا۔ کار پورچ میں رکھی اور لان کی طرف ہو لیا۔ وہاں وہ دونوں لڑکیاں مجھے ملیں۔ لیکن کچھ سہمی ہوئی، کچھ گھبرائی ہوئی، سلام دُعا کے بعد میری بہن نے مشورہ دیا کہ چونکہ کالج میں اس طرح ملنا قواعد کے خلاف ہے اس لیے باہر کسی رسٹوران میں ملا جائے۔ میں نے کہا کہ آپ باہر چلیں میں کار لے کر وہاں آتا ہوں۔ اب میں پورچ میں واپس آیا تو دیکھا کہ کار کی چابیاں ندارد ہیں۔ چابیاں مجھے یاد تھا کہ میں کار میں ہی چھوڑ گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چپراسی آیا اور کہنے لگا کہ میری چابیاں بڑی میم صاحب کے پاس ہیں۔ اور انھوں نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ مجھے اس بے ہودگی پر بہت غصہ آیا۔ جب میں پرنسپل کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ وہاں ایک ساٹھ برس کی حسینہ نتھنے پھلائے بیٹھی میری چابیوں کے گچھے سے کھیل رہی ہے۔ وہ مجھے دیکھتے ہی برس پڑی۔ "یہ کیا بدتمیزی ہے۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے پولیس والے میری دو لڑکیوں کو بھگا لے گئے تھے اگر دن دہاڑے اس قسم کی وارداتیں اور وہ بھی پولیس والے خود کرنے لگیں تو۔"

میں نے اپنا غصہ روکتے ہوئے کہا کہ میں ایک باعزت معزز شہری ہوں پولیس سے میرا کوئی تعلق نہیں اور میں کسی کو اغوا کرنے نہیں آیا۔ میں اپنی بہن سے ملنے

آیا ہوں۔ اور اس سے میرے متعلق پوچھا جا سکتا ہے۔ پرنسپل نے کاغذ کے پرزے پر کچھ لکھ کر چپراسی کو دیا۔ جو تھوڑی دیر کے بعد چٹ لے کر واپس آ گیا اور بولا "مس صاحب کہتی ہیں انھیں کچھ معلوم نہیں کہ یہ صاحب کون ہیں"

اب ان آپا جی کا پارہ اور بھی چڑھا اور انھوں نے مجھے اِدھر اُدھر کی سُنانا شروع کی۔

میں نے کچھ سوچ کر پھر کہا کہ میرے چچا سے فون کر کے میرے متعلق پوچھا جا سکتا ہے۔

انھوں نے فون کا نمبر ملایا اور غرائیں ــــ "ایک نوجوان جو اپنے آپ کو آپ کا بھتیجہ کہتا ہے، اس کالج میں لڑکیوں کا پیچھا کرتا ہوا پکڑا گیا ہے ــــ"

بیشتر اس کے کہ وہ چارج شیٹ پورا کرتیں، دوسری طرف سے ایک غصیلی آواز نے جواب دیا ــــ "میرا کوئی بھتیجہ نہیں آپ پولیس کو فون کر سکتی ہیں"

اب تو پرنسپل کا شک یقین میں بدل گیا۔ جسے میں نے بہن بتایا تھا، اس نے اس پاکیزہ رشتے سے انکار کر دیا۔ جسے میں نے باپ کا بھائی کہا اس نے خاندان کے چشم و چراغ کو پولیس کے حوالے کرنے کی صلاح دی۔ میرے سامنے دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں صرف یہی کہہ سکا کہ اگر پولیس کو بلانا ہے تو کپتان صاحب کو فون کیجیے کیوں کہ یہ گاڑی انھیں کی ہے۔

اس عورت نے آزمودہ سراغرساں کی طرح "ہوں" کہہ کے نمبر ملایا اور کپتان سے بولی ــــ "کپتان صاحب۔ اس بار آپ پکڑے گئے۔"

دوسری طرف سے کچھ آواز آئی۔ اور پھر پرنسپل بولی ــــ "آپ فوراً یہاں آ جائیے نہیں تو میں وزیر اعظم کو فون کر دوں گی"

پانچ منٹ کے اندر مسلح پولیس کے ایک دستے کے ساتھ ہمارا دوست

وہاں آن ٹپکا۔ پھر آہستہ آہستہ سب معاملہ کھل گیا اور ہماری وہاں سے رہائی ہوئی۔

اس واقعہ کے بعد خانہ آبادی کے اس طریقے کو ہم نے خیر باد کہہ دیا۔ اور ڈائرکٹ ایکشن شروع کیا۔ بدحواسیاں اس میں بھی ہوتی ہیں لیکن ذرا سستا ہی چھوٹ جاتا ہے انسان۔!

اگر آپ نوکری پیشہ ہیں تو آپ کو اپنے صاحب کے سامنے جانے کی بدحواسی کا تجربہ تو ہوا ہوگا۔ ہر نوکری پیشہ شخص کے دو روپ ہوتے ہیں۔ ایک ماتحتوں کے سامنے اور ایک اپنے افسر کے آگے۔ اور یہ دونوں ہی روپ اتنے متضاد ہوتے ہیں کہ اکثر تو حیرانی ہوتی ہے کہ ایک ہی چہرے کے دو روپ کیسے ہوسکتے ہیں؟ باس کے سامنے ہم نے بڑے بڑے سورماؤں کا دل دہلتے ہوئے دیکھا ہے۔ گھر کے بڑے بڑے شیر وہاں جا کر بلّی بن جاتے ہیں۔ اور بلّی بھی ایسی کہ میاؤں کرنا تک بھول جاتے ہیں۔ صاحب اگر کرسی پر بیٹھنے کو کہے تو کرسی کے سرے پر ایسے بیٹھتے ہیں جیسے تلوار کی دھار پر۔ ہاتھ خواہ مخواہ حرکت کرتے رہتے ہیں۔ کبھی ماتھے پر کبھی بٹن پر۔ کبھی ایک دوسرے کو ملنے لگتے ہیں۔ مسکرانے کی بے جا اور ناکام کوشش جاری رہتی ہے۔ اگر کوئی شریف صاحب آپ کے لیے چائے منگوائے تو پیالہ اور پلیٹ خواہ مخواہ ہلنے لگتے ہیں۔ یا تو چائے پی ہی نہیں جاتی یا پھر غٹاغٹ ایک ہی گھونٹ میں حلق میں انڈیل لی جاتی ہے۔ صاحب تعجب کرتے ہیں "ارے اتنی گرم چائے کیسے پی گئے؟" آپ جلے ہوئے ہونٹوں پر کٹی ہوئی زبان پھیرتے ہوئے نہایت دلیرانہ انداز میں کہتے ہیں "جی میری عادت ہی ایسی ہے۔" صاحب کا دونوں سر دن سے گیا بچہ دکھائی دے تو اپنے نئے جوڑے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے گود میں بٹھا لیا جاتا ہے۔ اور اس کی ذہانت کی تعریف میں ایک دو جملے کہے جاتے ہیں۔ صاحب

کی ذہانت کی تعریف میں ایک دو جملے کہے جاتے ہیں صاحب
باتوں باتوں میں کسی کی تعریف کردیں تو آپ بھی زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیتے
ہیں اور اگر انھیں کوئی شخص یا چیز ناپسند ہو تو ـــــ خیر یہ باتیں تو ہم سب
کے ساتھ ہوتی ہیں۔ دنیا ہے ہی ایسی۔ یہاں سبھی کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اور جب اتنا کچھ
کرنا پڑے تو پھر بدحواسیوں کو لازمی ہی نہیں، واجب بھی کہا جا سکتا ہے۔

چیستاں ہی چیستاں ہے زندگی اپنی

میں سمجھتا ہوں کہ یہ مصرعہ نہ صرف واحد متکلم پر لاگو ہوتا ہے بلکہ ساری مخلوقِ خدا کے لیے موزوں ہے۔ انسانی زندگی کے شروع سے لے کر آج تک ہزارہا فلاسفروں نے زندگی کے تجربے کا یہی نچوڑ نکالا ہے۔ جن لوگوں نے ساری زندگی، زندگی کے راز کا پتہ چلانے کے لیے وقف کر دی ان کی کاوشوں کا جواب بھی اسی سوال سے ملا۔ حضرت فانیؔ نے بھی کہا تھا ؎

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

بچپن میں تو خیر ہر بات ہی معمّہ نظر آتی ہے۔ بچّہ پیدا ہونے کے راز سے لے کر زمین کے گول ہونے کے ثبوت تک زندگی معموں سے بھرپور رہتی ہے اور کسی سوال کا تسلّی بخش جواب نہیں مل پاتا۔ جب آہستہ آہستہ رازوں کے پردے اُٹھنے لگتے ہیں، تب رازوں کی تفسیر معلوم کرنے

کا شوق باقی نہیں رہتا اور وہ زندگی کے "چیستاں" کو ایک حقیقت تسلیم کر لیتا ہے۔

ہم خود اس گزرتی ہوئی زندگی پر نظر ڈالتے ہیں تو ہزاروں سوالوں کا انبار آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے جن کا کوئی "تشفی بخش" جواب نہیں ملتا۔ اگر یادداشت ساتھ دیتی ہے تو سب سے پہلے سوالات جنھوں نے زندگی کو چیستاں بنایا کچھ اس قسم کے تھے :۔

۱۔ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے ؟

۲۔ ماسٹر کیوں پیٹتے ہیں ؟

۳۔ دن میں بار بار اتنی بھوک کیوں لگتی ہے ؟

۴۔ موت کیا ہوتی ہے اور انسان کیوں مرتا ہے ؟

۵۔ مردے کیوں نہیں بولتے ؟

۶۔ زندہ لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں ؟

۷۔ بیل گائے کی طرح سفید ہوتے ہوئے بھی دودھ کیوں نہیں دیتا ؟

۸۔ بھینس کالی ہوتے ہوئے بھی سفید دودھ کیوں دیتی ہے ؟

۹۔ محبت کیوں اور کس طرح ہوتی ہے ؟

۱۰۔ انسانوں کی طرح جانور کیوں نہیں بول سکتے ؟

۱۱۔ بڑے لوگ باتیں کیوں نہیں سمجھتے ؟

۱۲۔ ہینگنے کے وقت گدھا ہنستا ہے یا روتا ہے ؟ وغیرہ وغیرہ۔

سوالات تو خیر بہت تھے لیکن مختلف قسم کے یہ (۱۲) سوال نمائندہ حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ویسے بھی آپ جانتے ہیں کہ درجن کے حساب سے چیزیں خریدنا سستی پڑتی ہیں۔

جوں جوں ہم بڑے ہوئے کچھ سوالات تو خود ہی حل ہو گئے لیکن کچھ بالکل ہی الٹی شکل میں نمودار ہو گئے۔ مثلاً جہاں ہم پہلے یہ جاننے کی موڈ میں تھے کہ بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ وہاں اب یہ جاننے کا شوق ہے کہ یہ ایسے کیوں پیدا ہوتا ہے۔ پہلے اگر سوال یہ تھا کہ دن میں بار بار بھوک کیوں لگتی ہے تو اب یہ سوال ہے کہ خاطر خواہ بھوک کیوں نہیں لگتی؟ جہاں پہلے یہ حیرانی تھی کہ لوگ جھوٹ کیوں بولتے ہیں وہاں اب یہ حیرانی ہے کہ کچھ لوگ سچ کیوں بولتے ہیں؟ جہاں پہلے یہ گلہ تھا کہ بڑے لوگ باتیں کیوں نہیں سمجھتے۔ وہاں اب یہ شکایت ہے کہ بچے بات کیوں نہیں سنتے؟

کچھ ایسے سوال ہیں جن کا جواب جاننے کی اب کوئی خواہش باقی نہیں رہی۔ مثلاً یہ سوال کہ انسانوں کی طرح جانور کیوں نہیں بول سکتے؟ انسانوں کی قوتِ گفتار نے کیا کچھ کم ستم ڈھائے ہیں؟ اگر جانور بھی بول سکتے تو زندگی بے شک ناقابلِ برداشت ہو جاتی۔ کچھ ایسے سوال بھی ہیں کہ جن کا اتنے لوگوں نے جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ جی بھر گیا ہے اور اب ان کے متعلق اور کچھ جاننے کی خواہش نہیں رہی۔ ایسے سوالوں میں محبت اور موت کے متعلق سوالات بھی ہیں۔ موت کے متعلق اقبال کا تجزیہ دل کے ڈوبنے کو کافی ہے اور جاننے سے کیا فائدہ؟

کبھی کبھی ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سوالات آبِ حیات پی کر آئے ہیں۔ ایک شکل میں حل کیا تو دوسری شکل میں نمودار۔

اور پھر ان سوالوں کے علاوہ زندگی کے کچھ واقعات بھی ایسے ہوئے کہ ہم "صیبت" میں پھنس گئے۔ ایک واقعہ اس زمانے کا ہے جب ہم اسکول میں ایک بار غلطی سے جماعت میں اوّل آ گئے تھے اور سالانہ جلسۂ تقسیم انعامات میں ہمیں انعام دینا طے

پایا۔ جب جلسے میں ہمارا نام پکارا گیا تو ہم مارے شرم کے اُٹھ نہ سکے اور ایک دوسرا لڑکا جو ظاہر ہے بے شرم واقع ہوا تھا، اُٹھ کر ہمارے حصّے کا انعام لے گیا۔ زندگی کے پہلے انعام کے اس طرح ہاتھوں سے نکل جانے کا اتنا افسوس ہوا کہ ہم نے تہیہ کرلیا کہ زندگی میں پھر کبھی اوّل آنے کی زحمت نہیں اٹھائیں گے۔

اس کے برعکس ایسا واقعہ بھی یاد آتا ہے جب ہمیں غیر مستحقانہ طور پر خوش قسمتی مل گئی۔ ان دنوں ہم کالج میں پڑھاتے تھے۔ ایک بار طلبا اور پروفیسروں کے درمیان کرکٹ کا میچ طے پایا۔ اگر ہمیں زندگی میں کسی کھیل سے نفرت ہے تو وہ ہے کرکٹ۔ یہ کھیل اتنا مقبولِ عام ہے خاص کر نوجوانوں میں کہ ہمارے عذر کو کسرِ نفسی سمجھتے ہوئے کسی نے باور نہ کیا کہ ہم یہ کھیل نہیں کھیل سکتے۔ بارہا عذر کرنے کے باوجود ہمیں اسٹاف کی طرف سے اوپننگ بیٹسمین کی حیثیت سے کھیل کے میدان میں دھکیل دیا گیا۔ اب پہلا گیند ہماری طرف پھینکا گیا تو ہم نے خوف کے مارے سہم کر آنکھیں بند کرلیں اور جان بچانے کے لیے بیٹ کو اپنے سامنے کرلیا۔ دفعتاً ٹھک کی آواز آئی اور میدان تالیوں سے گونج اُٹھا۔ آنکھ کھولی تو معلوم ہوا کہ ہم نے چھکے کی باؤنڈری بنائی ہے۔ بہرحال اپنے اس کارنامے کے باوجود ہم آج تک کرکٹ نہیں پسند کرسکے۔ اور ہمارے سوالوں کی فہرست میں ایک سوال کا اضافہ ہوگیا ہے۔

"لوگ کرکٹ کیوں کھیلتے ہیں جب کہ وقت ضائع ہونے کے اور بہتر ذرائع موجود ہیں؟"

پھر نوکری کی تلاش کے سلسلے میں بھی کچھ ایسے واقعات پیش آئے جس سے زندگی کے چیستاں ہونے کا یقین اور بھی پختہ ہوگیا۔

سب سے پہلے لڑکیوں کے کالج میں ایک آسامی کے لیے انٹرویو کے

حاضر ہوئے۔

سلکشن بورڈ صرف ایک عمر رسیدہ بزرگ پر مشتمل تھا، سوال کیا گیا۔

"کتنا پڑھے ہو؟"

"ایم اے، بی اے آنرز فرسٹ کلاس فرسٹ میڈل یافتہ سرٹیفکیٹ آف میرٹ!" اور نہ جانے میں کیا کیا کہہ جاتا، اگر وہ بیچ میں نہ پوچھ اٹھتے۔

"خیر یہ اتنی اہم باتیں نہیں۔ شادی شدہ ہو؟"

"جی نہیں۔"

"تو برخوردار! کنوارے لڑکوں کو ہم لڑکیوں کے کالج میں نوکری کیسے دے سکتے ہیں؟"

انھوں نے نہایت ہمدردانہ لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے پوچھا۔

ہم نے جواباً عرض کیا:

"جی میرا تو خیال تھا اس کالج میں دونوں کام ایک ساتھ ہی بن جائیں گے۔"

ظاہر ہے کہ ایسے جواب سے نوکری سے جواب مل سکتا ہے۔ نوکری نہیں۔

ہم مایوس وناکام گھر واپس لوٹ آئے۔ اس واقعہ کے تین دن بعد والد صاحب کے نام ایک خط انھیں بزرگ کی طرف سے آیا۔ اپنی دختر نیک اختر کے ساتھ ہماری شادی کی تجویز پیش کی تھی اور پھر ملازمت کی گارنٹی بھی۔

اب ہماری باری تھی۔ شاید یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ ہم نے کیسا جواب دیا۔

دوسری بار ہم فوج کی نوکری کے لیے بلائے گئے تھے۔ خوب سوالات

جوابات ہوئے۔ آخر چیرمین نے پوچھا۔

"اگر تم یہاں نہیں لیے گئے تو کیا کروگے؟"

میں نے کہا کہ سول سروس کے لیے کوشش کروں گا۔

چیرمین نے بڑا دوستانہ مشورہ دیا۔ "بہتر ہے ابھی سے کوشش کر

بعد میں جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے۔ جب اس انٹرویو کا پوسٹ ما

کیا گیا تو احباب کا کہنا تھا میرا جواب صحیح نہیں تھا۔ مجھے کہنا چاہیے تھا کہ "

بار کوشش کروں گا، جب تک میں چنا نہیں جاتا۔ مجھے مکڑی کی مثال دینا

چاہیے تھا۔ انگریزی کی ایک نظم جو اسکول میں پڑھی ہو

TRY TRY AGAIN کا حوالہ دینا چاہیے تھا، یا ارجن کی ہٹ د

کی قسم کھانا چاہیے تھا۔ کچھ سیاسی قسم کے دوستوں کا خیال تھا کہ مجھے مرن برت کی

دھمکی دینا چاہیے تھا لیکن ابھی اس زمانے میں اس قسم کی چیزیں کچھ زیادہ مقبول

نہیں ہوئی تھیں۔ اور پھر مجھے اپنا بوجھ کم کرنے کی کوئی ایسی فکر بھی نہ تھی اور

زندگی سے کچھ ایسی نفرت ہی ہوئی تھی۔

واقعات تو خیر بہت ہیں لیکن کہاں تک سنائے جائیں۔ سب کا

حاصل یہ ہے کہ زندگی منطق اور استدلال کے اصولوں پر نہیں چلتی۔ ہونی

انہونی ہوجاتی ہے اور انہونی ہونی ہوجاتی ہے۔ کئی بار تو بھگوان خواہ مخواہ چھپر

پھاڑ کر دیتا ہے۔ اور کئی بار "بندہ جوڑے پلی پلی رام لڑھا دے کپا" والی بات

ہو جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے گویا زندگی میں قدم قدم پر موڑ ہے اور ہر موڑ پر

ایک اچنبھا۔ اس وقت جو نعرہ چیتاں اٹھتا ہے وہ انسان کے نزدیک خدا اور

اس کی کائنات کی برتری کا اعتراف ہے اور اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ اس دنیا نے نگار

بوالعجبیوں کی کمی نہیں ہوسکتی۔ ہاں ان کو جاننے کے اشتیاق میں ضرور کمی ہو سکتی ہے۔